ماہنامہ
صراطِ مستقیم
برمنگھم
February 2021

وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

صراطِ مستقیم برمنگھم

بیاد

مولانا فضل کریم عاصم رحمہ اللہ

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

Vol: 41 No. 04 February 2021

Jumada AlThani/ Rajab 1442 AH

جلد: 41 شمارہ: 04 فروری 2021ء

جمادی الثانی، رجب 1442ھ

فہرست مضامین

Correspondence Address:

SIRAT-E-MUSTAQEEM

20 Green Lane, Small Heath,

Birmingham B9 5DB

Tel: 0121 773 0019

Fax: 0121 766 8779

ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith UK

www.mjah.org.uk/siratemustaqeem

E-mail: info@mjah.org.uk

سعودی عرب کے شمال مغرب میں واقع تاریخی شہر 'العلا' میں گزشتہ دنوں سعودی عرب کی سربراہی میں خلیجی تعاون کونسل کا 41 واں غیر معمولی نوعیت کا ایک اہم اِجلاس انعقاد پذیر ہوا، جس میں تمام رکن ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کے تناظر میں یہ اجلاس اِنتہائی اہمیت کا حامل بھی تھا اور اس کو ایک تاریخی اجلاس بھی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں دیگر کئی اہم اُمور پر فیصلوں کے علاوہ برادر ملک قطر کے ساتھ پچھلے تین سال سے جاری تناؤ کو ختم کرنے کی غرض سے تمام تر اختلافات کو ماضی کا حصہ بنا کر ایک نئے عزم اور عہد کے ساتھ خطہ کے امن واستحکام اور مسلم یکجہتی کو مضبوط بنانے کے ایک نئے عزم کے ساتھ کونسل کے تمام رُکن ملکوں خصوصاً سعودی عرب اور قطر کے درمیان تمام تر سفارتی، تجارتی اور دیگر نوعیت کے تعلقات کی بحالی کے فیصلے کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

ویسے بھی سعودی عرب کے ولی عہد پرنس محمد بن سلمان بن عبد العزیز کا 'العلا' ایئرپورٹ پر بنفس نفیس انتہائی گرم جوشی سے امیر قطر سے معانقہ کرتے ہوئے پر جوش استقبال کرنا سعودی عرب اور قطر کے درمیان مصالحت کا نقطۂ آغاز تھا۔

اس عظیم پیش رفت کو عالمِ اسلام سمیت دنیا کے کئی اَہم ترین ملکوں نے سراہا اور اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ساری اُمت خصوصاً خلیجی ممالک سمیت مشرق وسطیٰ کا سارا علاقہ انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اُمت مسلمہ کی مجموعی پستی اور بدحالی سب پر عیاں ہے۔ عالمی سطح پر اُمت کو ایک مرد بیمار کی حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں اپنے طویل خفیہ ایجنڈے کو پوری ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہی ہیں، حالات کی سنگینی اس درجہ پر پہنچ چکی ہے کہ مظلوم کو مجرم قرار دیا جا رہا ہے اور ظالم اپنی مظلومیت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

دوسری جانب احساس زیاں سے محروم یہ اُمت مختلف اکائیوں میں بٹ چکی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے، تحفظات اور مصلحت پسندی کے نام پر مفاد پرستی عروج پر ہے۔ اَبتری کا یہ عالم ہے کہ کچھ بدبخت عناصر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر دشمنان اسلام کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں مختلف پلیٹ فارمز پر اُمت کے درمیان اتحاد ویکجہتی ناگزیر ہے، جس کے ذریعہ مشترکہ مفادات اور مقاصد کی تکمیل ممکن ہو سکتی ہے۔ نیز اُمت کے گرد منڈلانے والے فتنوں کا سدباب بھی اسی اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ مشروط ہے۔

ان حالات میں خلیجی تعاون کونسل کے درمیان اتحاد و یکجہتی اور تعلقات کی بحالی ایک محفوظ اور پُرامن مستقبل کے لیے جان فزا نوید ہے۔

نیز خلیجی تعاون کونسل اور خصوصاً سعودی حکومت کا یہ جرأت مندانہ اقدام، ان تمام موقع پرست اسلام دشمن عناصر کی سازشوں کو ناکامی سے دوچار کر سکتا ہے جو خلیجی ملکوں کے درمیان فتنوں کو ہوا دے کر اپنے مذموم مذہبی اور سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے میں کوشاں ہیں اور یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ خلیجی ممالک کے تمام سربراہوں کو ان تمام خطرات کی ہولناکی کا مکمل ادراک حاصل ہے۔ چنانچہ مصالحت کے اس فیصلہ کے ذریعہ ان بدنیت عناصر کو کھلے الفاظ میں یہ پیغام دیا جا چکا ہے کہ خلیجی تعاون کونسل کے کسی ایک رکن ملک کی جانب بری نگاہ ڈالنے والوں اور اس کے امن وسلامتی کے درپے ہونے والوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ کونسل کے نزدیک اس قسم کا اقدام خلیجی تعاون کونسل کے تمام ممالک کے خلاف تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ تمام رکن ممالک اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ ہر قسم کے بیرونی خطرے سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔

اس وقت شام، یمن اور لیبیا کی نازک صورتحال سب پر عیاں ہے۔ اس کے پس پردہ وہ کونسے خفیہ ہاتھ ہیں جو جنگ کی آگ کو مسلسل ہوا دے کر خلیجی ممالک تک رسائی پانا چاہتے ہیں، یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں۔ امت کے بدخواہ ان عناصر کا مقصد دولت سے مالا مال خلیجی ممالک کو مذہبی، سیاسی اور معاشی طور کمزور کرنا ہے۔ خصوصاً سعودی عرب ان کے نشانے پر ہے۔ جس کو الحمد للہ سارے عالم اسلام میں امت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی مقدس سرزمین پر حرمین شریفین کی موجودگی کی وجہ سے بے شک سعودی عرب اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط اور محفوظ قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی بقا میں عقیدۂ توحید کی بقا مضمر ہے۔ چنانچہ دین توحید کی حفاظت کو سعودی عرب اور اس کی حکومت نے ہر دور میں اپنی اعلیٰ ترجیحات میں شامل رکھا ہے اور جہاں سعودی حکومت مقامات مقدسہ حرمین شریفین کی آباد کاری میں کئی بلین ڈالرز ہر سال

بے دریغ خرچ کر کے ان کی عمارتوں کو انتہائی شان دار بنانے اور ان کو دورِ جدید کی تمام سہولتوں سے آراستہ کرنے میں کوشاں ہے، وہی عمرے اور حج بیت اللہ کی غرض سے سعودی عرب کا قصد کرنے والے زائر مسلمانوں کو اعلیٰ ترین درجہ کی سہولتیں مہیا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتی ہے۔
حرمین شریفین کی خدمات کے علاوہ ساری دنیا میں دین توحید کی اشاعت، اس کی سربلندی کی غرض سے ہزاروں مساجد، دینی مدارس، اسلامی مراکز کی تعمیر اور ان کا قیام سعودی حکومت کی دین اسلام کے ساتھ گہری وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔
الغرض سعودی عرب کی دینی، ملی اور علمی اپنی خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ چند صفحات میں اس کو سمیٹنا ناممکن ہے اور یہی چیز دین توحید کی مخالف قوتوں کو کسی بھی شکل میں منظور نہیں۔ اسی لیے آج بھی بعض عناصر منظم منصوبہ بندی کے تحت سعودی عرب کے خلاف پروپیگنڈا کر کے اُمت کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹنے کے درپے ہیں۔
جبکہ سعودی عرب ہمیشہ اُمت کو مشترکہ مقاصد کے تحت ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے ان میں اتحاد، یکجہتی کو فروغ دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔
رابطۃ العالم اسلامی مکۃ المکرمہ اور 58 اسلامی ممالک پر مشتمل تنظیم او آئی سی OIC کہ جس کا ہیڈ کواٹر جدہ میں ہے۔ جس کا نمائندہ وفد اقوام متحدہ کے ہیڈ کواٹر میں موجود رہتا ہے، سعودی عرب کی اتحاد امت میں خدمات کا واضح ثبوت ہے۔
اتحاد اُمت کی انہیں مساعی میں 'العلا' کا یہ اجلاس ہے جو شاہ سلمان بن عبد العزیز حفظہ اللہ کی سربراہی میں منعقد کیا گیا۔ یقیناً اس اجلاس میں منظور شدہ فیصلے شدید مایوسی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں اُمید کی کرن بن کر اُبھر رہے ہیں۔ ان کے دیرپا مفید اثرات نہ صرف خلیجی ممالک کے محفوظ مستقبل کی ضمانت دے رہے ہیں بلکہ یمن، لیبیا، عراق، لبنان اور شام میں جاری خون ریزی پر قابو پانے میں یہ فیصلے اہم کردار ادا کریں گے۔

☆☆☆

جو درس گاہِ نبوت سے فیض یاب نہ ہو گا

جو نقش پائے محمد (ﷺ) پہ چل نہیں سکتا
کبھی وہ دین کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتا
وہ زندگی میں کبھی پھول پھل نہیں سکتا
جو راہِ شوق میں کانٹوں پہ چل نہیں سکتا
ہو جسکے دل میں محبت رسولِ اکرم (ﷺ) کی
فریب اس پہ زمانے کا چل نہیں سکتا
جنونِ خام نہیں ہو گا پختہ کار کبھی
خرد کی گود میں جب تک وہ پل نہیں سکتا
ہو جس کے سامنے ہر وقت اسوۂ حسنہ
وہ حشر میں کفِ افسوس مل نہیں سکتا
کہیں اماں نہیں دامانِ مصطفیٰ کے سوا
یہ فیصلہ ہے خدا کا جو ٹل نہیں سکتا
بدلتے رہتے ہیں خود ساختہ نظام سدا
مگر نظام الٰہی بدل نہیں سکتا
رسول پاک (ﷺ) کا اسوہ جو ہم نہ اپنائیں
خدا چشمۂ رحمت اُبل نہیں سکتا
جو درس گاہ نبوت سے فیض یاب نہ ہو
ہزار کھا کے بھی ٹھوکر سنبھل نہیں سکتا
سکون و چین ملے گا تو بس مدینے میں
رسولِ پاک (ﷺ) سراج منیر کے آگے
چراغ اور کسی کا بھی جل نہیں سکتا
متاعِ سوزِ محبت سے ہے جو بیگانہ
دل اس کا خوفِ خدا سے پگھل نہیں سکتا

حضرت ابو البیان حماد عمری

ہشام بن عبد الملک کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک آدمی ہشام بن عبد الملک کے پاس آیا اور ان سے کہا، میری چار باتیں یاد رکھو، ان سے آپ کی سلطنت درست رہے گی اور آپ کی رعایا ٹھیک چلتی رہے گی، وہ چار باتیں یہ ہیں:
1۔ ایسا وعدہ ہرگز نہ کیجیے جس کو پورا کرنے کا آپ کو اپنے اوپر اعتماد نہ ہو۔
2۔ اگر اترنا مشکل ہے تو آسان ترین بلندی پر بھی چڑھنے کی کوشش نہ کیجیے۔
3۔ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے آپ ہمیشہ ہر چیز کے انجام پر نظر رکھیں۔
4۔ تمام امور ناگہانی آفات سے خالی نہیں، لہٰذا پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔

(نفحۃ العرب: ص132)

حافظ محمد نعمان فاروقی

نبی کریم ﷺ کو اللہ نے جہاں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا وہاں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ کمال درجے کے ماہر نفسیات تھے۔ نفسیات میں مہارت مختلف قسم کے معاملات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، مثلاً: ایک داعی ماہر نفسیات ہو گا تو اسے اندازہ ہو گا کہ سامعین کیا محسوس کر رہے ہیں، ان کے تاثرات کیا ہیں؟ ان کی ذہنی استعداد کیسی ہے؟ یہ کس فن سے منسلک لوگ ہیں۔ اسی طرح نفسیات میں مہارت اساتذہ کرام کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ محکمہ پولیس اور عدالت سے وابستہ لوگوں کے لیے نفسیات کا علم انتہائی مفید ہے۔

نفسیات کا علم دورِ جدید میں ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کے آغاز کے متعلق جاننا چاہیں تو اس بارے میں دوسری رائے نہیں ہو گی کہ اس کے موجد بھی معلم انسانیت ﷺ ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو یہ اقرار کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ سے بڑھ کر کوئی ماہر نفسیات نہیں تھا۔ آپ ﷺ ایسے دور میں ایک کامل و اکمل ماہر نفسیات تھے جس دور میں لوگ نفسیات ہی سے نا آشنا تھے۔ سیرت کے اوراق میں ایک کامل و اکمل ماہر نفسیات ہونے کے چند ایک پہلو یہ ہیں:

چہرہ شناسی...چند واقعات

1۔ نماز میں مجھے کچھ یاد آ گیا تھا: رسول اکرم ﷺ چہرہ شناسی میں بڑے ماہر تھے۔ سیدنا عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کی اقتدا میں عصر کی نماز ادا کی جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو جلدی سے اٹھے اور اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ بعد ازاں واپس تشریف لائے اور آپ نے لوگوں کے چہروں پر اپنے جلدی چلے جانے کی وجہ سے تعجب کا اظہار دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمانے لگے:

«ذَكَرْتُ وَ أَنَا فِي الصَّلَاةِ تِبْرًا عِنْدَنَا فَكَرِهْتُ أَنْ يُمْسِيَ أَوْ يَبِيتَ عِنْدَنَا فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِهِ»

"نماز کے دوران ہی مجھے اپنے ہاں پڑا ہوا سونا یاد آ گیا تھا، لہٰذا میں نے ناپسند جانا کہ وہ ہمارے ہاں شام تک یا رات تک رہے، اس لیے میں نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا ہے۔" (صحیح بخاری: 1221)

اس سے واضح ہے کہ نبی ﷺ چہروں کے تاثرات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ انھیں تعجب سا تھا کہ آپ ﷺ تو نماز کے بعد تشریف فرما ہوتے ہیں مگر آج جلدی کیوں تشریف لے گئے ہیں اور ان کا تعجب چہروں سے عیاں تھا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان کے چہرے پڑھ لیے تھے۔

2۔ نبی ﷺ نے صعب رضی اللہ عنہ کا چہرہ بھانپ لیا: سیدنا صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انھوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں جنگلی جانور کا ہدیہ پیش کیا۔ اس وقت آپ ﷺ ابواء یا ودان جگہ پر تھے۔ آپ نے وہ ہدیہ صعب رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا لیکن جب آپ ﷺ نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو فرمانے لگے: «إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ إِلَّا أَنَّا حُرُمٌ» "ہم نے یہ ہدیہ محض اس لیے واپس کیا ہے کہ ہم حالت احرام میں تھے۔" (صحیح بخاری: 1825)

3۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر پریشانی کا عالم دیکھ لیا: ایک دفعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیوں کو بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی اور بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما تھے۔ میں جس صورت حال کا سامنا کر چکا تھا، اسے آپ ﷺ نے میرے چہرے سے بھانپ لیا اور پوچھنے لگے کہ آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے؟ میں نے عرض کی کہ آج جیسی صورتِ حال میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ (صحیح بخاری: 3091)

4۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے بوجھل محسوس کیا: اس ضمن میں حسب ذیل واقعہ بھی درج کیا جا سکتا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی ایک اونٹنی تھی۔ اسے عضباء کہا جاتا تھا وہ کبھی پیچھے نہیں رہی تھی۔ ایک دفعہ ایک دیہاتی آیا۔ اس کے پاس جوان اونٹ تھا۔ (اس نے اس اونٹنی کے ساتھ مقابلہ کیا تو) وہ آگے گزر گیا۔ مسلمانوں پر یہ چیز بڑی گراں گزری۔ آپ ﷺ نے اس صورت حال کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے:

«حَقٌّ عَلَى اللهِ أَنْ يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا وَضَعَهُ»

"اللہ کا قانون ہے کہ اس دنیا کی جو بھی چیز عروج کو پہنچتی ہے اسے زوال بھی آتا ہے۔"

(صحیح بخاری: 2872)

دیکھا آپ نے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صورت حال سے اندازہ لگا لیا کہ لوگ عضباء اونٹنی کے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے پریشان ہیں اور پھر کیسے حوصلہ دیتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھائی۔

5۔ میرے ساتھ چلو!: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں پیٹ پر پتھر باندھے بھوک کی شدت سے

زمین پر لیٹ جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں ایک ایسے راستے پر بیٹھ گیا جہاں سے لوگوں کا گزر ہوتا تھا۔ اس دوران سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے تو میں نے قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق ان سے سوال کیا۔ میں نے تو محض اس لیے سوال کیا تھا کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں گے مگر وہ گزر گئے اور اس حوالے سے کچھ نہ کہا۔ بعد ازاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ گزرے ان سے بھی میں نے ایک آیت کے متعلق پوچھا اور پوچھنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں مگر وہ بھی بغیر کچھ کہے گزر گئے۔ اس کے بعد نبی ﷺ تشریف لائے تو آپ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے اور جو میرے دل میں تھا وہ آپ نے بھانپ لیا اور میرے چہرے کے تاثرات بھی پہچان گئے۔ معاً فرمانے لگے: «يَا أَبَاهِرٍّ» "ابوہریرہ!" میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ فرمایا: «الْحَقْ» "آؤ میرے ساتھ چلو۔" اور آپ ﷺ چلنے لگے۔ میں آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ گھر داخل ہوئے تو میں نے اندر جانے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ داخل ہوئے تو آپ نے وہاں دودھ کا ایک پیالہ دیکھا تو آپ نے پوچھا: "یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟"

(صحیح بخاری:6452)

چہرہ شناسی اور سوال کرنے والے کے اسلوب ہی سے بات سمجھنا آپ ﷺ کے ماہر نفسیات ہونے کی ایک عمدہ دلیل ہے۔

بات سمجھانے کے لیے مناسب موقع کا انتخاب

آپ ﷺ کی یہ بھی عادت مبارکہ تھی کہ آپ لوگوں کے ذہنوں میں بات بٹھانے کیلئے مناسب موقع کا انتخاب فرماتے۔ نفسیات یہی بتاتی ہے کہ مناسب موقع کا انتخاب اور انداز بات کو ذہن نشین کر دیتا ہے اور ایسی بات پُر اثر ہوتی ہے۔

1۔ اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ مہربان ہے: ایک غزوے کے موقع پر قیدی خواتین میں سے ایک خاتون کا دودھ پیتا بچہ گم ہو گیا۔ وہ بڑی بے قراری سے اپنے بچے کو کبھی ادھر کبھی ادھر تلاش کر رہی تھی۔ اچانک اسے بچہ مل گیا۔ اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی اس بے قراری کو دیکھ رہے تھے۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نبی ﷺ نے صحابہ کو اہم راز بتایا، چنانچہ فرمایا: «أَتَرَوْنَ هٰذِهِ الْمَرْأَةَ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ» "تمھارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اللہ کی قسم! نہیں جب تک اس میں طاقت ہو گی یہ کبھی ایسا نہیں ہونے دے گی۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا»
"یقیناً اللہ اپنے بندوں پر اس عورت سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

(صحیح بخاری:5653، صحیح مسلم:2754)

اس عملی صورت کے ذریعے سے اللہ کی شفقت اور مہربانی کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانا لوگوں کی نفسیات سمجھنے کی ایک واضح دلیل ہے۔ یہ مثال ہمارے سامنے بہت سے پہلو نمایاں کرتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ماں کی محبت بچے سے اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب بچہ دودھ پیتا ہو اور یہ محبت و شفقت بہت بڑھ جاتی ہے جب بچہ گم ہو کر دوبارہ ملے اور خصوصاً جب حالت جنگ میں نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اس کے بعد ملے۔ آپ ﷺ نے ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اللہ کی اپنے بندوں سے محبت، شفقت اور مہربانی کو واضح کیا۔

2۔ جیسے تم چودھویں کا چاند دیکھ رہے ہو: ایک رات آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے جلوہ نما تھا۔ (گویا چاند اور ستاروں کا دلکش منظر آسمان پر تھا اور ایک چاند اپنے ستاروں کے ساتھ زمین پر جلوہ گر تھا) نبی ﷺ یہ منظر دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمانے لگے: "بے شک تم بغیر کسی رکاوٹ کے روز قیامت اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کرو گے بالکل اس طرح جیسے تم ابھی یہ چودھویں کا چاند دیکھ رہے ہو۔" (صحیح بخاری:554)

اپنی پسندیدہ چیزوں سے لگاؤ کی نفسیات

انسان کی نفسیات میں یہ چیز شامل ہے کہ اسے اپنی پسندیدہ چیز اور خصوصاً ایسی چیز جو اپنی ملکیت میں بھی ہو اور پسند بھی ہو تو اسے وہ چیز از حد بھاتی ہے۔ وہ اس کا خیال رکھتا ہے اور اس سے ایک لگاؤ سا رکھتا ہے۔ بڑوں کی نسبت بچوں میں یہ خوبی زیادہ پائی جاتی ہے۔ بچے اپنے کھلونوں کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں بلکہ اپنے ساتھ ہی سلاتے ہیں... عہد نبوی میں بھی ایک نو عمر صحابی ابو عمیر نے ایک چڑیا پال رکھی تھی جس سے وہ کھیلتے تھے۔ ایک دن وہ چڑیا مر گئی۔ آپ ﷺ انھیں ان الفاظ سے تسلی دینے لگے:

«يَا أَبَا عُمَيْرٍ! مَا فَعَلَ النُّغَيْرَ» "ابو عمیر! چڑیا کا کیا بنا؟" (صحیح بخاری:6203)

تسلی دینے کے الفاظ بھی بہت تھے اور انداز بھی بہت مگر سوالیہ انداز اختیار کر کے اسے تسلی دینا اور ساتھ ساتھ خوش طبعی کرنا نفسیات میں مہارت کی دلیل ہے۔ غالباً آپ ﷺ نے ابو عمیر رضی اللہ عنہ پر اداسی کے اثرات دیکھ کر یہ انداز اختیار کیا ہو گا۔

مہم جوئی کے لیے ہم خیال لوگوں کا انتخاب

انسان کی نفسیات بتاتی ہے کہ کوئی بھی ادارہ چلانے اور کسی قسم کی مہم سر کرنے کے لیے ہم خیال اور ہم نوالہ و پیالہ لوگوں کا ہونا بہت ہی سود مند ہوتا ہے۔ سوچ بھی ملتی ہو۔ فکر بھی ایک جیسی ہو اور سرگرمیاں بھی ملتی جلتی ہوں تو مشکل سے مشکل مہمات بھی آسانی سے سر ہو جایا کرتی ہیں۔ ہمارے پیغمبر ﷺ بھی ذمہ داریاں سونپتے وقت انسانی نفسیات کے اس پہلو کو مد نظر رکھا کرتے تھے۔ ڈھونڈنے سے کئی ایک مثالیں سامنے آسکتی ہیں مگر سر دست ہم ایسے دو دوستوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں آپ ﷺ نے کئی مواقع پر اکٹھے بھیجا۔

یہ تھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ۔ شاید جرأت وشجاعت اور بہادری وجوانمردی کی صفات نے ان دونوں کو گہرا دوست بنادیا تھا۔ ان کی باہمی دوستی کی دلیل تو وہ حدیث ہے جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میری صورت حال یہ تھی کہ مذی کی شکل میں گاڑا پانی نکلتا رہتا تھا لیکن آپ ﷺ سے سوال کرنے سے میں شرم محسوس کرتا تھا، اس لیے میں نے سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ آپ ﷺ سے سوال کریں، لہٰذا انھوں نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شرم گاہ کو دھویا جائے اور وضو کر لیا جائے۔

(صحیح بخاری:178، 132)

اس حدیث سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کی دوستی کا پتہ یوں چلتا ہے کہ شرم کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال نہیں کیا مگر راز داری سے کام لیتے ہوئے سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ گویا یہ ان کے راز دان تھے۔ نبی کریم ﷺ کو غالباً اس کا اندازہ تھا اس لیے آپ ﷺ نے انھیں متعدد مہمات کے لیے اکٹھے بھیجا۔

غزوۂ احد کی تیاری ہو رہی ہے۔ نبی ﷺ اپنی جان نثار سپاہ کو مورچہ زن کر رہے ہیں۔ فوج کے اہم ترین حصے میمنہ اور میسرہ پر دو سالاروں کو مقرر کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ ﷺ میمنہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور میسرہ پر سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کو مقرر فرماتے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے خط کی خبر ملی۔ اس خط میں انھوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کی مکہ کی طرف پیش قدمی سے مطلع کرنا چاہا تھا۔ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ نے ایک خاتون کے ذریعے یہ خط روانہ کیا تھا۔ وہ خط لے کر روانہ ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ کی نگاہیں ایسے افراد کو تلاش کر رہی تھیں جو راستے ہی سے خط واپس لے آئیں۔ بالآخر آپ ﷺ کی نگاہ انتخاب سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ اور آپ ﷺ نے انھیں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی فرمایا: «انْطَلِقُوا حَتّٰى تَاْتُوا رَوْضَةَ خَاخٍ بِها ظَعِينَ مَعَها كِتَابٌ فَخُذُوهُ مِنْها» ”تم اب نکل پڑو۔ جب تم روضۂ خاخ پہنچو گے تو وہاں تمھیں پالکی میں سوار ایک عورت ملے گی۔ اس کے پاس خط ہوگا، وہ تم نے اس سے لینا ہے۔“

یہ تینوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے گئے اور روضہ خاخ پہنچے تو وہاں سوار عورت موجود تھی۔ اس سے ملے اور بالآخر خط اس سے نکلوالائے۔ وہ خط اس نے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔ (صحیح بخاری:4890)

باپ اور بیٹے کے درمیان نہ بیٹھا جائے

باپ اور بیٹے کا تعلق بہت گہرا اور فریفتگی پر مبنی ہوتا ہے اور اگر بیٹا چھوٹی عمر میں ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ابو کے ساتھ ساتھ رہے۔ نبی کریم ﷺ نے آداب مجلس بیان کرتے ہوئے فرمایا: «لَا يَجْلِسُ الرَّجُلُ بَيْنَ الرَّجُلِ وَابْنِهِ فِي الْمَجْلِسِ» ”کوئی شخص کسی آدمی اور اس کے بیٹے کے درمیان مجلس میں نہ بیٹھے۔“ (المعجم الاوسط: 4/358؛ والسلسلۃ الصحیحۃ، حدیث:3556)

آپ ﷺ نے غلام اور اس کے بیٹے کو ایک ہی جگہ ہبہ یا فروخت کرنے کی ترغیب دی ہے (صحیح مسلم، حدیث: 1371(474)) تاکہ وہ دونوں ایک ہی جگہ رہیں اور ایک دوسرے سے دوری کی اذیت تو کم از کم نہ جھیلیں۔

اولاد انسان کی کمزوری ہے

شاید آپ نے کبھی یہ جائزہ لیا ہو کہ آپ کو اپنی نسبت اپنی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ خوشی ہوتی ہے، یعنی ایک شخص آپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو آپ کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے تو آپ کے ہاں دوسرے کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ اولاد انسان کی کمزوری ہے۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا دیکھ کر انسان بہت خوش ہوتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نفسیات کے اس پہلو سے بھی آگاہ تھے۔ آپ ﷺ مجلس میں ہوتے، آپ کے لیے نیا پھل لایا جاتا تو آپ مدینہ کے لیے وہاں کے پھلوں کے لیے اور ناپ تول کے پیمانوں کے لیے برکت کی دعا فرماتے، پھر دیکھتے کہ ان میں سے وہاں موجود بچوں میں سے چھوٹی عمر کا کون ہے اور وہ پھل اسے تھما دیتے۔ (صحیح مسلم:1371)

اس سے ایک تو انسان ترجیحات کے چکر سے بچ جاتا ہے کہ کسے دے اور کسے نہ دے۔ اور اگر خود کھا لے تو بھی معیوب سا لگتا ہے کہ لوگوں کے سامنے اکیلا کھا رہا ہے۔ لیکن اگر وہاں موجود سب سے چھوٹے بچے کو دے دیا جائے تو بڑوں کو اعتراض بھی نہیں رہتا اور اس بچے کے رشتے دار اپنی جگہ خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ کوئی چیز بڑوں میں سے کسی کو دے دی جائے تو وہاں موجود بچوں کو یہ بات بہت محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں کی نفسیات سمجھ کر اس کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا کسی ماہر نفسیات ہی کا کام ہو سکتا ہے، اسی لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات کے علم کی داغ بیل بھی حضور ﷺ ہی نے ڈالی۔

سائل کی نفسیات کو سمجھنا

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ سے ایک ہی نوعیت کا سوال دو قسم کے فرد کرتے تو آپ انھیں علیحدہ علیحدہ جواب دیتے، مثلاً: آپ ﷺ سے متعدد بار صدقے کے متعلق سوال ہوا۔ آپ نے مختلف جواب ارشاد فرمائے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے سوال کیا: ”کون سا صدقہ اجر میں بڑا ہے؟“ فرمایا: «أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ، تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى» ”تم اس حال میں صدقہ کرو کہ تندرست و توانا بھی ہو اور مال کی حرص بھی ہو، تمھیں کنگھال ہونے کا خدشہ بھی ہو اور مالدار ہونے کی امید بھی ہو۔“

(صحیح بخاری:1419)

اسی طرح کا سوال کسی اور نے کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: «خِدْمَةُ عَبْدٍ فِي سَبِيلِ اللهِ أَوْ ظِلُّ فُسْطَاطٍ أَوْ طَرُوقَةُ فَحْلٍ فِي سَبِيلِ اللهِ» "اللہ کے راستے میں غلام کی خدمت پیش کرنا یا خیمے کے ذریعے سائے کا اہتمام کرنا یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں نر جانور کو پیش کرنا تاکہ (زیادہ سواریوں کا انتظام ہو سکے)۔" (جامع ترمذی:1626)

اسی طرح ایک تیسرے شخص نے آپ ﷺ سے کسی اور موقع پر یہی سوال کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: «جَهدُ الْمُقِلِّ» "جس کے پاس تھوڑا سا ہے مگر وہ کوشش کر کے خرچ کرتا ہے۔"

(صحیح سنن أبی داود، حدیث:1196)

آپ ﷺ سائلین کی نفسیات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر جواب ارشاد فرماتے۔

شک میں مبتلا ہونے کی نفسیات

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان بہت جلد شک میں پڑتا ہے۔ خصوصاً جب معاملہ مخالف جنس سے متعلق ہو تو خواہ مخواہ غلط خیالات اور شکوک وشبہات جنم لینے لگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نفسیات کے اس پہلو سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ حسب ذیل واقعہ اس کی گواہی دیتا ہے۔

نبی ﷺ مسجد نبوی میں اعتکاف بیٹھے تھے۔ اس دوران آپ ﷺ کی زوجہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئیں۔ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ واپس جانے لگیں تو آپ ان کے ساتھ مسجد کے دروازے تک چلے آئے۔ یہاں سے انصار کے دو آدمیوں کا گزر ہوا۔ ان دونوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور تیزی سے چلنے لگے۔ اس دوران آپ نے فرمایا: «تَعَالَيَا، إِنَّمَا صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ» "ادھر آؤ! یہ صفیہ بنت حیی ہیں۔" وہ دونوں عرض کرنے لگے: سبحان اللہ! اللہ کے رسول! (بھلا ہم کیسے شک کر سکتے ہیں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ، وَإِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُلْقِيَ فِي أَنْفُسِكُمَا شَيْئًا» "بے شک شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے اور مجھے خدشہ ہوا کہ شیطان تمھارے دل میں کوئی بات نہ ڈال دے۔" (صحیح بخاری:2038)

سٹیٹس اور عہدے کی چاہت

انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے ہمیشہ معیار اور عہدے کی جستجو میں رہتا ہے۔ خصوصاً جب کوئی اعزاز یا عہدہ ملا ہو تو اس سے دستبردار ہونے کو بہت مشکل تصور کرتا ہے۔ ہاں! اسے اس کا کوئی متبادل اعزاز مل جائے تو پھر اس قدر محسوس نہیں ہوتا۔ ایک ایسی ہی مثال دیکھیے۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، قریش کی قیادت کر رہے تھے۔ نبی ﷺ نے مکہ کی طرف اس طرح پیش قدمی فرمائی کہ انھیں کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ﷺ مرالظہران میں فروکش تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ اگلے دن صبح سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو کفار قریش کی سرداری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ نبی کریم ﷺ کو اس بات کا احساس تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی تلافی کی کوشش کرتے ہوئے اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے مشورے سے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ایک اہم ترین اعزاز سے نوازتے ہوئے حکم جاری فرمادیا: «مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهوَ آمِنٌ» "جو کوئی ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی حویلی میں چلا جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔" (صحیح مسلم:1780)

نبی ﷺ کی طرف سے محض ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے لیے یہ اعزاز نبی ﷺ کی علم نفسیات میں مہارتِ تامہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہی وہ اقدامات تھے کہ ایمان ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے دل میں گھر کر گیا اور وہ ایک عظیم اسلامی شخصیت کے طوپر ابھرے اور انکے لخت جگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنہری تاریخ میں بڑا نام کمایا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔

قابل حرمت چیزوں کا احترام

انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کو وہ قابل احترام سمجھتا ہے تو اس کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام برداشت نہیں کرتا۔ فوراً احتجاج کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار کر لیتا ہے جو قدیم ورثہ چلا آ رہا ہو لوگ اسے اسی حالت میں دیکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کی نفسیات ہے۔ نبی اکرم ﷺ نفسیات کے اس پہلو سے خوب واقف تھے۔ آیئے! ایک واقعے کی روشنی میں یہ جانتے ہیں۔ نبی ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«يَا عَائِشَةُ! لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهدِمَ، فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ، وَأَلْزَقْتُهُ بِالْأَرْضِ، وَجَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ، بَابًا شَرْقِيًّا وَبَابًا غَرْبِيًّا، فَبَلَغْتُ بِهِ أَسَاسَ إِبْرَاهِيمَ» "اے عائشہ! اگر تمھاری قوم نے عہد جاہلیت کو نیا نیا خیر باد نہ کہا ہوتا تو میں بیت اللہ کے انہدام کا حکم دیتا اور اس کا جو حصہ بغیر تعمیر کے رکھا گیا تھا اسے بھی اندر شامل کرتا اور اسے زمین کے برابر لے آتا اور اس کے مشرقی اور مغربی جانب دو دروازے رکھتا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر اسے استوار کرتا۔"

(صحیح بخاری:1586)

نبی کریم ﷺ کعبۃ اللہ کی بہتری کے لیے یہ سارے اقدامات کرنا چاہتے تھے کہ عام لوگوں کی رسائی ہو جائے۔ اور اکثریت مسلمان ہو چکی تھی مگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کیا اور پھر اقدام نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ دلائل واضح کر رہے ہیں کہ نبی ﷺ کفار کی طرف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے خدشات کا اظہار فرما رہے تھے۔ حالانکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خواہ وہ نئے نئے ہی مسلمان ہوئے ہوں، ان کی طرف سے ایسا کوئی تصور نہیں تھا کہ وہ آپ ﷺ کے اقدام کے خلاف کوئی تصور رکھنے کی جرأت کریں گے۔ دراصل آپ ﷺ ان کے دل میں اٹھنے والے کسی ایسے تصور کو بھی جگہ نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ قابل احترام مقامات یا شخصیات کے متعلق لوگوں کی نفسیات کچھ اور ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اعلیٰ پائے کے ماہر نفسیات تھے۔ اس بارے میں آپ ﷺ کی راہ نمائیاں امت کے لیے بہترین سرمایہ ہیں۔ ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر صہیب حسن (لندن)

مسلمان خاتون کا نامعلوم مرد کے نطفہ کو حاصل کر کے رحم میں داخل کرنے کا حکم

سوال 1: ایک خاتون نے استفسار کیا ہے کہ ان کے شوہر جنسی لحاظ سے انتہائی کمزور تھے، اس لیے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی نامعلوم مرد کے منجمد نطفے کو حاصل کر کے اسے اپنے رحم میں داخل کروا دیں تا کہ اس طرح وہ ایک بچے کی ماں بن سکیں، یہ تجربہ کامیاب رہا اور وہ اب ایک بچی کی ماں بن چکی ہیں، ان کا سوال ہے کہ آیا اس بچی کی نسبت ان کی طرف یا ان کے شوہر کی طرف کی جا سکتی ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا یہ فعل ناجائز تھا، کسی غیر مرد کا نطفہ اپنے رحم میں داخل کرنا درست نہ تھا کہ اس طرح ایک بچے کے نسب کا جاننا ممکن نہیں رہتا، اب جبکہ یہ واقعہ ہو چکا ہے تو اس کا تدارک ایسے ہو سکتا ہے کہ آپ توبہ کریں، کثرت سے استغفار کریں، اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ » (سنن أبي داؤد:2158)

"ایک مؤمن کے لیے یہ جائز نہیں کہ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو کہ اپنا پانی کسی اور کی کھیتی کو سیراب کرنے دے۔"

یہ عمل حقیقۃً تو زنا نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ جنسی اتصال نہیں پایا گیا لیکن نتائج کے اعتبار سے زنا کے حکم میں آتا ہے۔

بچی کی نسبت کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

کیونکہ بچی کا باپ مجہول ہے اس لیے اس کی نسبت صرف ماں کی طرف کی جائے، اور یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جس بچے کا باپ نامعلوم ہو تو اس کی نسبت ماں کی طرف کی جائے جیسے عیسیٰ ابن مریم۔ اور قرآن کریم کی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہ تھا اور وہ معجزاتی طور پر حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (ص ح)

خلاف شریعت وصیت پر عمل نہیں کیا جائے گا

سوال 2: اگر ایک شخص ایسی وصیت چھوڑ جائے کہ اس کا ترکہ شریعت کی منشا کے خلاف تقسیم ہوتا ہو تو کیا ایسی وصیت کی پابندی کی جا سکتی ہے؟ یا اسے شریعت کے مطابق ہی تقسیم کرنا چاہیے؟

جواب: یہ بات تو قطعی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وراثت کے احکام قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں اور ہر وارث کا حصہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بدلنے کی، ایک مؤمن کو پورا یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تقسیم وراثت عدل وانصاف پر قائم ہے جس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ترکہ کی تقسیم اللہ کے حکم کے مطابق کی جائے گی، نہ اس میں کمی کی گنجائش ہے، نہ بیشی اور اس لحاظ سے مذکورہ وصیت شریعت کے مخالف ہونے کی بنا پر جائز نہیں ہے۔

البتہ اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ اگر تمام ورثہ مورث کی موت کے بعد خود ہی اس بات راضی ہو جائیں کہ وہ ترکہ کو برابر تقسیم کر لیں، یعنی اپنا حصہ یا اپنے حصے کا ایک جزو دوسرے کے حق میں چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں، تو ایسا کیا جا سکتا ہے اور وہ اس لیے کہ اب وہ خود اس مال کے مالک ہیں اور ان کے لیے جائز ہے کہ ایک شخص دوسرے کے حق میں اپنے کچھ مال کو چھوڑ دے۔ (ف ک)

کرسمس ٹری کی خرید وفروخت ناجائز ہے

سوال 3: کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں ایسی وِگ کی تجارت کر سکوں کہ جو کلی طور پر یا جزوری طور پر انسان کے بالوں سے بنائی گئی ہو؟ اور کیا کرسمس کا درخت بیچنا جائز ہے؟

جواب: دو باتوں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے:

1۔ وِگ: جو انسانی بالوں سے بنائی گئی ہو، اسے وَصل کہا جاتا ہے جو کہ ممنوع ہے، اس کا استعمال بھی اور اس کا بیچنا بھی۔

2۔ دوسری وہ وِگ جو مصنوعی بالوں سے بنائی گئی ہو تو وہ مذکورہ ممانعت میں داخل نہیں ہوتی، اسے لیے اس کا استعمال یا اس کی بیع جائز ہے۔ اور جہاں تک کرسمس 'ٹری' کی بات ہے تو ہمارے نزدیک اس کا بیچنا ناجائز ہے اور وہ اس لیے کہ اس کا شمار عیسائیت کے دینی شعائر میں سے ہوتا ہے اور ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کے دینی شعائر کی بیع وشراء کرے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت کے مطابق نبی ﷺ اگر گھر میں کوئی ایسی چیز دیکھتے جس میں صلیب ہو تو وہ اسے توڑ ڈالتے۔

(صحیح بخاری:5952)

صلیب عیسائیت کا شعار ہے اور ایسے ہی عیسائیت کے دوسرے شعائر کا حکم ہے۔ (ف ک)

غیر شرعی لباس بنانے والی کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال 4: کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں ایسی کمپنی میں کام کروں جو خواتین کے بھڑکیلے لباس بناتی ہے، یہ کمپنی مرد اور عورت ہر ایک کے لیے

کپڑے تیار کرتی ہے، لیکن بعض نسوانی لباس شرم وحیا کے معیار پر نہیں اترتے، ویسے میرا اپنا کام معلومات کی ٹیکنالوجی سے متعلق ہے؟

جواب: اگر آپ کے کام کا تعلق بیع وشراء سے نہیں، صرف معلومات کی ٹیکنالوجی سے ہے، تو اس کام میں کوئی حرج نہیں، اب وہ شرم وحیا سے عاری لباس کا فروخت کرنا جو کہ مردانہ اور زنانہ ملبوسات کا ایک حصہ ہے، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں دکھائی دیتا کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لباس مشروع طریقے سے استعمال کیے جائیں، اصل گناہ تو اس شخص پر ہے جو انہیں ناجائز طریقے سے استعمال کرتا ہے۔(ف ک)

حمل کے 120 دن کے بعد اسقاط کرنا، ایک زندہ جان کو قتل کرنے کے مترادف

سوال5: میں یوکے میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتا ہوں، بعض دفعہ ہمارے پاس ایسی خواتین آتی ہیں جو اسقاط حمل کے لیے انہیں ہسپتال بھیجے جانے کے لیے مطالبہ کرتی ہیں اور بعض دفعہ دو ڈاکٹروں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس عمل سے متعلق فارم پر دستخط کریں تو آیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟

جواب: روح کے پھونکے جانے کے بعد اسقاط حمل ناجائز ہے، یعنی ایک سو بیس دن کے بعد، کیونکہ روح پھونکے جانے کے بعد اسقاط کرنا ایک زندہ جان کو قتل کرنے کے مترادف ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت طبیب اس عمل کے جواز کے لیے دستخط کرنا ایک گناہ پر اِعانت کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (المائدۃ: 2)

”اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور سرکشی والے کاموں پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

اور جب تک آپ اس بات کے مختار ہیں کہ دستخط کریں یا نہ کریں تو آپ نہ ہی ایسے فارم پر دستخط کریں اور نہ ہی ایسی خواتین کو اس ناجائز کام کے لیے ہسپتال بھیجیں اور یہ بھی ملاحظہ رہے کہ قانون بھی اس بات کے کرنے کو لازم نہیں قرار دیتا۔ لیکن اگر حمل مدت مذکورہ سے کم دنوں کا ہو اور آپ یہ سمجھیں کہ یہ مطالبہ جائز معلوم ہوتا ہے تو پھر آپ دستخط کر سکتے ہیں الّا یہ کہ ایسا کرنے میں کسی قانون کی مخالفت ہوتی ہو۔(ف ک)

نوٹ بابت رموز: ’ص ح‘ یعنی کاتب سطور کا اپنا تحریر کردہ فتویٰ ہے۔ ’ف ک‘ یعنی فتویٰ کمیٹی برطانیہ جو یورپین کونسل برائے فتویٰ اور ریسرچ کی ذیلی کمیٹی ہے اور کاتب سطور اس کا ممبر ہے۔ یہ فتاوی عربی یا انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

☆☆☆

چار چیزیں نیک بختی کی علامت

چار چیزیں آدمی کی نیک بختی کی علامت ہیں:

1۔ نیک بیوی

2۔ نیک اولاد

3۔ نیک ہم نشین

4۔ اور یہ کہ اس کا رزق اس کے شہر میں ہو۔

(رواہ الدیلمی فی الفردوس: 2/196)

اللہ عزوجل نے آخری نبی محمد بن عبد اللہ ﷺ کو اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجا: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّـهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ہمارے اعمال اس وقت تک صالح نہیں بن سکتے جب تک سنت کے مطابق انجام نہ پائیں، چونکہ سنت معیارِ حق ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخری نبی ﷺ کی سنت کی بھی حفاظت فرمائی۔ اس کی حفاظت کے لیے ایسی شخصیات پیدا فرمائیں جن کی ذہانت، قوت حافظہ، ضرب المثل، حصول علم کی راہ میں جن کی قربانیاں بے مثال، دیانت و امانت، ورع، تقویٰ اور عمل کرنے کا شوق اپنے دور میں فقید المثال رہا ہے۔

ان اولوالعزم ہستیوں نے جمع و ترتیب احادیث کی راہ میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ مستشرقین کو گواہی دینی پڑی: " ليفتخر المسلمون على علم حديثهم ماشاؤوا" رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسری ایسی شخصیت نہیں گزری جس کے شب و روز کے اقوال و اعمال کو ایسے محفوظ کیا گیا ہو جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو محفوظ کر دیا گیا، ہر دور میں اس علم پر زور دیا گیا، خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عموماً پیش آمدہ مسائل میں کبار صحابہ سے استفسار کیا کرتے کہ اس مسئلہ میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان سنا ہے۔

اگر جواب ہاں میں ملتا تو خلیفہ اول کا فیصلہ بھی اسی کے مطابق ہوتا، خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت کی ابتداء میں پابندی لگا رکھی تھی کہ سینئر صحابہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مدینہ منورہ سے باہر نہ جائیں تاکہ کسی مسئلہ میں ہنگامی مشورہ کی ضرورت پیش آ جائے تو محافظین سنت کی جماعت موجود رہے اور اسی کے مطابق فیصلے کیے جاتے رہے۔ سنت کے مطابق حکومتی معاملات، قضاء و عدلیہ کے مسائل وغیرہ کے حل کرنے کا یہی سلسلہ چلتا رہا، یہ سنت پر عمل اور حفاظت کا بہترین طریقہ تھا، حتیٰ کہ حضرت عمر بن العزیز رحمۃ اللہ علیہ جنہیں تاریخ اسلام میں خلفاء راشدین کے بعد نہایت نمایاں حیثیت حاصل ہے جن کی وفات 101ھ میں ہوئی، انہوں نے احادیث کو جمع کرنے کا پہلی صدی ہجری میں ہی حکم جاری کیا تھا، یوں ابتداء ہی سے اس علم پر بہت زور دیا گیا۔ لہٰذا دوسری صدی ہجری کے آغاز میں ہی حدیث کے مختلف مجموعے وجود میں آئے، صحیفہ صادقہ ہمام بن منبہ 132ھ، مجموعہ سعید بن ابی عروبہ 156ھ، ربیع بن صبیح 160ھ، مؤطا امام مالک بن انس 179ھ وغیرہ وغیرہ۔ پھر مختلف کتابیں مرتب ہوئیں، ان میں کتب ستہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، اگرچہ اس کے علاوہ احادیث کی بہت سی کتابیں ہیں اور ہر کتاب کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام محدثین اور علماء کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ جنہوں نے بڑی جانفشانی سے گلشن حدیث کی باغبانی کی، ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت ہر دور میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احکام کو سمجھنے کے آسان مواقع میسر آ سکے۔

اس وقت ہم مشہور کتاب ترمذی کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں، لہٰذا ہماری بات اسی کتاب تک محدود ہو گی۔ حدیث کی اس کتاب کا تعارف اور اس کی چند خصوصیات سے پہلے صاحب کتاب امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی چند سطریں پڑھ لیجیے:

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی وفات 279ھ، صاحب تقویٰ، فہم و بصیرت سے مالا مال، حفظ و اتقان میں یکتا تھے۔ امام صاحب کی ذہانت اور ذکاوت کے واقعات بہت زیادہ ہیں، وقت کے مشاہیر علم و فن نے شاندار الفاظ میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف و توصیف کی۔ آپ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، کسب فیض کے بعد جب اپنے علاقہ کو روانہ ہو رہے تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہونہار شاگرد کے متعلق جو کلمات خیر کہے وہی ان کی شان بلکہ استاذ اور شاگرد دونوں کی عظمت بڑھانے کے لیے کافی ہیں۔

"لقد استفدت منك أكثر ما استفدت مني." "یعنی تم مجھ سے جتنا مستفید ہو سکے ہو میں اس سے زیادہ تم سے مستفید ہوا ہوں۔" اس توصیفی جملہ میں ایک طرف امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی شان چھلک رہی ہے تو دوسری طرف خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع اور اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کا بے لوث جذبہ، کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیچھے خراسان میں کوئی شاگرد ایسا نہ چھوڑا جو علم، حفظ احادیث اور زہد و ورع میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم پلہ ہو۔

استاذ اور شاگرد دونوں کی کتابوں میں متعدد وجوہات سے مماثلت پائی جاتی ہے کہ صرف احادیث کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ دونوں بزرگوں نے احادیث کو مسائل زندگی سے قریب تر کرنے کی ایسی کوشش کی کہ بیشتر مسائل اور الجھنوں کا حل حدیث میں دکھائی دے سکے۔

علم و عمل کا یہ روشن ستارہ اپنے پیچھے مختلف قیمتی کتابوں کے علاوہ جامع ترمذی جیسی بیش بہا کتاب چھوڑ کر 279ھ غروب ہو گیا اور اس کتاب سے

متلاشیانِ حق ہر دور میں استفادہ کرتے رہے اور ان شاءاللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ان کے نامۂ اعمال کو وزنی اور ہماری پیاس بجھاتا رہے گا۔

ترمذی کے دو مشہور نام ہیں: جامع الترمذی، سنن الترمذی، جامع اور سنن میں معمولی سا فرق کیا گیا کہ 'جامع' اس میں زیادہ جامعیت اور شمولیت ہے، اس سے مراد حدیث کی وہ کتاب جس میں مسائل عبادت کے علاوہ ایمان وعقائد، زہد، آداب، رقاق، مناقب اور فضائل وغیرہ کی احادیث بھی مذکور ہوں اور سنن میں عموماً مسائل عبادت پر زور ہوتا ہے، ضمناً دوسرے امور بھی ہو سکتے ہیں، ترمذی کا شمار کتب حدیث میں چوتھے نمبر پر ہے، اس میں متنوع عنوانات پر مشتمل چھیالیس (46) کتابیں اور تین ہزار نو سو چھپن (3956) احادیث ہیں۔

شیخ الاسلام ابو اسماعیل رحمہ اللہ نے کہا کہ عوام کے لیے جامع ترمذی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے کیونکہ بخاری ومسلم سے درست استفادہ اہل علم اور ماہرین کرسکتے ہیں جبکہ ترمذی سے عام لوگ بھی مستفید ہوسکتے ہیں۔ اس کا اسلوب عام فہم اور آسان ہے۔

شاید اس لیے اس کتاب کے بارے یہاں تک کہا گیا کہ جس گھر میں یہ کتاب ہو گویا کہ وہاں نبی کریم ﷺ خود تشریف فرماہیں اور مسائل بتارہے ہیں۔

معنوی لحاظ سے یہ بات درست ہوسکتی ہے، مگر امام ترمذی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ کہنا کہ انہوں نے خود ہی اپنی تصنیف کے متعلق یہ کہا ہو گا محل نظر ہے، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس قول کی امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف نسبت پر عدم اطمینان کا اظہار ہے۔

یہ حدیث اور فقہ یعنی فقہ السنہ کا گویا مجموعہ ہے، اس میں روایت اور درایت کی دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ ایک عنوان کے تحت حدیث ذکر کر کے اس کی سند کا درجہ بھی بتاتے ہیں اور حسب ضرورت راویوں پر جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق گفتگو بھی کرتے ہیں، بسا اوقات یہ گفتگو چند جملوں میں کی ہے اور کبھی کئی سطروں میں اس پر بحث کی ہے۔

بعض راوی کنیت اور القاب سے مشہور ہوتے ہیں ان کے ساتھ ان کے ناموں کی صراحت کردی گئی تاکہ کوئی مغالطہ نہ ہونے پائے اور حسب ضرورت کسی کے نام کے ساتھ اس کی کنیت کی وضاحت کی گئی۔

عنوان کے مطابق ایک حدیث ذکر کر کے اسی مضمون کی اگر کئی احادیث ہوں تو ان کی طرف بھی مختصر اشارات کردیے گئے کہ اس موضوع کی فلاں فلاں صحابی سے مزید احادیث مروی ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو اشارات کئے ہیں کہ اور بھی احادیث اسی عنوان کی پائی جاتی ہیں، بعد میں آنے والے علماء نے ان مشار الیہ احادیث کو بھی الگ سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اللباب فیما استخرج الإمام في الباب، اس طرح مزید کئی حدیث کے مجموعے وجود میں آئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی کتاب میں عموماً احادیث کی تکرار نہیں کرتے اور نہ ہی ایک عنوان کے تحت ایک سے زیادہ احادیث ذکر کرتے ہیں، سوائے کسی خاص سبب کے، یوں یہ کتاب مختصر اور جامع ہوئی۔

ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک حدیث ذکر کر کے، صحابہ، تابعین اور کبار علماء وفقہاء کے نام بھی ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے اسی حدیث کے مطابق اپنی رائے یا فتویٰ دیا ہے۔ اس سے مزید اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ اتنی معروف اور متداول حدیث ہے کہ اس کے مطابق مختلف علماء کا عمل اور فتویٰ بھی ہے۔ اس سے ملتی جلتی صفت صحیح بخاری میں تعلیقات کی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے پوری کتاب میں سوائے دو احادیث کے کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کی جس کے مطابق اہل علم کا فتویٰ یا عمل نہ ہو۔ ان دونوں احادیث کے مطابق بھی فتویٰ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسی حدیث کتاب میں درج نہیں جس پر علماء کا فتویٰ نہ ہو۔

فقہاءِ اربعہ کے اقوال پر زور اور تقلید پر اصرار کے نظریہ پر بھی روک لگتی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے متعدد فقہاء کے نام حسب موقع ذکر کیے ہیں۔ یوں دینی مسائل کو چار ائمہ میں محصور کرنا، علمی، تاریخی اور واقعاتی کسی بھی اعتبار سے درست نہیں، گوکہ ان چاروں گرامی قدر بزرگوں کا مقام ومرتبہ معروف ومسلم ہے لیکن علم وفہم کی دنیا اس سے وسیع تر ہے۔

اہمیت حدیث صحیح پر عمل کرنے کی ہے نہ کہ کسی کی مجرد رائے یا فتویٰ پر، قطع نظر اس بات سے کہ وہ اپنے دور یا علاقہ کی کتنی ہی معتبر شخصیت ہو، علماء ربانی نے ہر دور میں اپنے تلامذہ میں یہی بیج بویا کہ حق جہاں سے بھی اور جب بھی ملے قبول کرلو۔

احادیث پر تحقیق وتنقیح کا سلسلہ ہر زمانہ میں چلتا رہا اور آج بھی جاری ہے، مختلف ماہرین نے میدان تحقیق میں گرانقدر خدمات انجام دیں تاکہ اس مبارک علمی ورثہ میں کوئی آمیزش نہ ہونے پائے۔

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ ووسائل میں حیرت انگیز ترقی ہوئی، ایک بٹن دبا کر ایک عنوان کی مختلف احادیث ایک جگہ دیکھی جاسکتی ہیں، مطلوبہ حدیث کے ساتھ ہی اس کی سند کا صحت وضعف کے اعتبار سے درجہ بھی واضح ہو تو قاری کے لیے نہایت آسانی ہوگی کہ زیر بحث مسئلہ میں مذکورہ درجہ کی حدیث سے کس حد تک استفادہ ممکن ہے۔ دورِ حاضر میں مختلف علماء نے خاص محنت کی ہے، جس میں علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور ساری صحیح احادیث

کو فقہی ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع کرنے کا بڑا کارنامہ ڈاکٹر شیخ محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کے حصہ میں آیا۔ الجامع الکل کا پہلا ایڈیشن مکتبہ دار السلام ریاض نے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن لاہور سے محترم مولانا ابن بشیر الحسینوی نے اپنی نگرانی میں چھاپ کر علمی دنیا کو نایاب تحفہ دیا۔ ٹیکنالوجی کی اس ترقی کے بعد طالب علم کو کسی مخصوص عالم کی رائے کا مقید کرنا آسان نہیں رہا۔

ترمذی کا گہرائی سے مطالعہ قاری کے اندر اعتدال پیدا کرتا ہے، دینی مسائل میں توسع اور یسر کا پہلو غالب ہے۔ کسی ایک رائے پر اصرار مناسب نہیں اور نہ ہی کسی خاص مسلک کا تعصب درست ہے، گویا اختلافات کی کڑی دھوپ میں یہ کتاب اعتدال کی ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتی ہے۔

آخر میں کتاب العلل کا اہم اضافہ ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ فن حدیث کا یہ مشکل عنوان ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس میں اپنے کچھ اصول بیان کیے ہیں اور کچھ وضاحتیں بھی کی ہیں گویا اس کی حیثیت ایک طرح سے کتاب کے مقدمہ کی بھی ہو گئی۔ بجائے بار بار وضاحتیں کرنے کے ایک دفعہ انہوں نے بیان کر دیا کہ کس جملہ اور اصطلاح کا وہ کیا معنٰی لیتے ہیں اور کس لقب یا کنیت سے ان کی مراد کون راوی ہے وغیرہ وغیرہ اور ساتھ ہی لوگوں کے لیے فن علت کی طرف رہنمائی بھی کر دی گئی۔

اس کتاب کی شاید اہمیت اور عظمت کے سبب ہی مختلف علماء نے ہر دور میں اس میں گہری دلچسپی لی، مختلف ممالک کے دینی مدارس کے نصاب میں یہ داخل ہے۔ اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔ ان میں علامہ الشیخ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی شرح تحفۃ الاحوذی جو کہ عربی زبان میں ہے۔ عالم اسلام میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

☆☆☆

اپنے گھروں کا جائزہ لیجئے

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فكلما كان أهل البيت أكثر قراءة للقرآن، وأكثر مذاكرة للأحاديث، وأكثر ذكرا لله وتسبيحا وتهليلا، كان أسلم من الشياطين وأبعد منها.

وكلما كان البيت مملوءا بالغفلة، وأسبابها من الأغاني والملاهي والقيل والقال، كان أقرب إلى وجود الشياطين المشجعة على الباطل."

"جس گھر والے جتنا زیادہ قرآن پڑھیں گے، پیارے رسول ﷺ کی احادیث کا مذاکرہ کریں گے اور اللہ کے ذکر واذکار میں مصروف رہیں گے وہ گھر اتنا ہی زیادہ شیطان سے دور اور ان کی آفات و شرور سے محفوظ رہے گا۔ اس کے برعکس جس گھر والے جتنا زیادہ اللہ کے ذکر و اذکار سے غافل ولاپرواہ ہوں گے یعنی گانے بجانے، لہو و لعب اور قیل و قال میں مصروف رہیں گے اس گھر میں اتنا ہی زیادہ شیطانوں کا بسیرا ہو گا۔"

(الفوائد العلمية من الدروس البازية: 142/1)

مسلمان آدمی سے اللہ کی خاطر ملاقات کے لیے جانا

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَنَّ رَجُلًا زَارَ أَخًا لَهُ فِيْ قَرْيَةٍ أُخْرٰى، فَأَرْصَدَ اللّٰهُ لَهُ عَلٰى مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا ، فَلَمَّا أَتٰى عَلَيْهِ قَالَ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ: أُرِيْدُ أَخًا لِيْ فِيْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ. قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا؟ قَالَ: لَا ، غَيْرَ أَنِّي أَحْبَبْتُهُ فِي اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ. قَالَ: فَإِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكَ بِأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيْهِ»

"ایک آدمی اپنے مومن، مسلمان بھائی کی ملاقات کے لیے دوسرے گاؤں کی طرف گیا۔ اللہ عزوجل نے اس کی راہ میں ایک فرشتے کو (انسانی شکل وصورت میں) کھڑا کر دیا۔ جب یہ آدمی وہاں پہنچا تو اس فرشتے نے پوچھا: ہاں بھائی! کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہنے لگا: اس (قریب والی) بستی میں میرا ایک بھائی ہے، میں اس سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ فرشتے نے پوچھا: کیا اس آدمی کا تمہارے اوپر کوئی احسان ہے؟ جس کا بدلہ چکانے کے لیے تم اس کے پاس جا رہے ہو؟ کہنے لگا: نہیں، اس کا میرے اوپر کوئی احسان نہیں ہے۔ میں تو اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ فرشتہ کہنے لگا: میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اس کی ذات کے لیے اپنے مسلمان بھائی سے محبت کرتے ہو۔"

(صحیح مسلم:6549)

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

جمیل اختر

یہ مسئلہ انتہائی اہم اور اکثر و بیشتر لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بکثرت دعا کرتے ہیں لیکن ان کی دعا قبول نہیں ہوتی! آخر وجہ کیا ہے کہ لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی؟

یوں تو اس کی متعدد وجوہات ہیں لیکن بنیادی وجہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا مسنون طریقے سے دعا نہیں مانگتا اور دعا کی قبولیت کی وہ شرائط، جن کا دھیان رکھنا ضروری ہے، ان کا اپنی دعا میں اہتمام نہیں کرتا۔ جس طرح ایک حکیم کسی مریض کو دوا دیتا ہے اور اس کے ساتھ کئی چیزوں سے احتیاط، اجتناب اور پرہیز بھی تجویز کرتا ہے کہ اگر مریض ان پر عمل کرے گا تو تندرست ہو جائے گا لیکن اگر وہ مریض ان تدابیر و تجاویز پر عمل نہ کرے اور جتنی چاہے دوا استعمال کرتا رہے تو وہ دوا کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اِلا یہ کہ ان احتیاطوں اور تدابیر پر عمل نہ کرلے جو حکیم نے اسے بتائی ہیں۔ دعا کی قبولیت کی بھی اسی طرح چند شرائط ہیں جو قرآن و سنت سے حاصل ہوتی ہیں، جب تک ان شرائط پر عمل کرتے ہوئے دعا نہ کی جائے، دعا قبول نہ ہو گی۔۔۔ وہ شرائط بالاختصار درج ذیل ہیں:

دعا کی شرائط وضوابط

1۔ اخلاص

دعا کی قبولیت کے لیے سب سے اہم اور ضروری شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کو اپنا حقیقی معبود سمجھتے ہوئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، غیر اللہ سے دعا نہ کرے۔ اللہ کے دَر کے علاوہ اور دَر پر اپنی جھولی نہ پھیلائے۔ خالقِ حقیقی کو چھوڑ کر مخلوق کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَادْعُوا اللَّـهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾

”تم خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارو۔“(غافر:14)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”اس آیت سے ثابت ہوا کہ اخلاص قبولیتِ دعا کی لازمی شرط ہے۔“(فتح الباری:11/95)

2۔ حرام سے اجتناب

کسی شخص کا کوئی نیک عمل اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک کہ وہ حرام کاری اور حرام خوری سے مکمل اجتناب نہ کرے لیکن اگر وہ حرام کا کھائے، حرام پیے، حرام کا پہنے تو اس شخص کے نیک اعمال ہرگز شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے اور چونکہ دعا بھی ایک نیک عمل ہے، اس لیے یہ بھی اسی صورت میں قبول ہو گی، جب دعا کرنے والا ہر حرام کام سے اجتناب کرے۔ بصورتِ دیگر اس کی دعا ہرگز قبولیت کے لائق نہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ایک آدمی لمبا سفر طے کرتا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، چہرہ خاک آلود ہے اور وہ (بیت اللہ پہنچ کر) ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: یارب! یارب! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام کا ہے اور حرام سے اس کی پرورش ہوئی تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو کیسے قبول کرے۔“(صحیح مسلم:1015)

3۔ توبہ

اگر دعا کرنے والا دعا کرے اور ساتھ گناہ والے کام بھی کرتا رہے یا ان سے توبہ نہ کرے تو ایسے شخص کی دعا بارگاہِ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لیے دعا کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے، توبہ اور استغفار کرے جیسا کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

﴿وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ﴾

”اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پالنے والے سے اپنی تقصیروں کی معافی طلب کرو اور اس کی جناب میں توبہ کرو، تاکہ وہ برسنے والے بادل تم پر بھیج دے اور تمہاری طاقت پر اور طاقت بڑھا دے اور تم گناہ گار ہو کر روگردانی نہ کرو۔“(ہود:52)

4۔ عاجزی وانکساری

دعا میں عاجزی وانکساری اختیار کرنے کا حکم قرآن مجید میں اس طرح دیا گیا کہ

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾

(الاعراف:55)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور خوب عاجزی کا اظہار کرنا چاہیے۔

5۔ دعا کے اندر زیادتی نہ کی جائے

اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی زیادتی و تجاوز سے منع فرمایا ہے، بالخصوص دعا میں زیادتی سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾

(الاعراف:55)

”تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو، گڑگڑا کر اور چپکے چپکے بھی۔ واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو حد سے نکل جائیں۔“

دعا میں زیادتی کی کئی صورتیں ہیں مثلاً حرام اور ممنوع چیزوں کے لیے دعا کرنا یا ہمیشگی کی زندگی کی دعا کرنا یا بلاوجہ کسی کے لیے بری دعا کرنا، اسی طرح کی تمام زیادتیوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

6۔ معلق دعا نہ کی جائے

معلق دعا سے مراد وہ دعا ہے جس میں دعا اس طرح کی جائے کہ اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے تو مجھے عطا کر دے اور اگر چاہتا ہے تو بخش دے۔ اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ یا اللہ اگر تو بخشنا نہیں چاہتا تو نہ بخش۔ اگر عطا نہیں کرنا چاہتا تو عطا نہ کر۔۔۔ تیری مرضی! حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنْ شِئْتَ، اللَّهُمَّ ارْحَمْنِي إِنْ شِئْتَ، لِيَعْزِمِ المَسْأَلَةَ، فَإِنَّهُ لاَ مُكْرِهَ لَهُ»

"تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ یا اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما بلکہ پورے عزم سے دعا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" (صحیح بخاری: 6339؛ صحیح مسلم: 2678)

7۔ غفلت اور سستی نہ دکھائی جائے

دعا مانگنے میں کسی قسم کی سستی نہیں برتنی چاہیے بلکہ پورے دھیان، توجہ اور چستی کے ساتھ دعا مانگنی چاہیے اور دعا مانگنے والے کا ذہن دعا کے اندر مشغول ہونا چاہیے، نیز اس پر کسی قسم کی سستی (خیالات یا نیند وغیرہ) نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ دعا کرنے والا اگر سستی میں مبتلا ہوگا یا غفلت کا شکار ہوگا تو اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ اس لیے نبی ﷺ نے فرمایا:

«ادْعُوا اللَّهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ»

"اللہ سے اس یقین کے ساتھ دعا مانگو کہ دعا ضرور قبول ہوگی اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی غافل اور لاپرواہ دل سے نکلی دعا کو قبول نہیں فرماتے۔" (جامع ترمذی: 3479؛ السلسلۃ الصحیحۃ: 2/143)

دعا کے آداب

مذکورہ بالا شرائط ایسی ہیں جنہیں دعا میں ملحوظ خاطر رکھنا از بس ضروری ہے جبکہ ان کے علاوہ بعض آداب ایسے ہیں کہ اگر دعا کرنے والا ان کا بھی اہتمام کرے تو پھر اس کی دعا شرفِ قبولیت حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان مستحب آداب میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1۔ دعا سے پہلے طہارت (پاکیزگی)

دعا کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ ظاہری (باوضو) اور باطنی (استغفار) طہارت حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ قبولیت دعا میں وضو کے مستحب ہونے کی دلیل ابو عامر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور نبی اکرم ﷺ سے ان کے استغفار والے قصے میں موجود ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو ان کی شہادت کی خبر پہنچی اور ان کے لیے استغفار کی درخواست کی گئی تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا پھر آپ ﷺ نے وضو کر کے دعا فرمائی۔ (صحیح بخاری: 4323)

لیکن یاد رہے کہ دعا سے پہلے وضو ہونا ضروری نہیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ہر دعا وضو کے ساتھ نہیں مانگی بلکہ کئی دعائیں آپ ﷺ نے بغیر وضو کے مانگی ہیں۔

2۔ حمد و ثنا اور آنحضرت ﷺ پر درود

دعا مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی جائے اور بعد میں آنحضرت ﷺ پر درود بھیجا جائے اور اس کے بعد اپنی حاجت کا سوال کیا جائے۔ یہ ترتیب مستحب ہے جیسا کہ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو نماز میں دعا کرتے ہوئے سنا مگر اس نے آپ ﷺ پر درود نہ بھیجا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «عجل هذا» "اس نے جلدی کی۔" پھر اسے بلا کر اور دوسرے لوگوں کو بھی فرمایا کہ

« إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَمْجِيدِ رَبِّهِ جَلَّ وَعَزَّ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَدْعُو بَعْدُ بِمَا شَاءَ»

"جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو پہلے حمد و ثنا کرے پھر نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے پھر جو وہ چاہے دعا کرے۔" (سنن ابو داؤد: 1481، وسندہ صحیح، صحیح الجامع: 1/238)

3۔ افضل حالت اور افضل مقام پر دعا

دعا کی قبولیت کے لیے یہ بھی مستحب ہے کہ انسان افضل حالت میں اور افضل جگہ پر دعا کرے۔ افضل حالت سے مراد یہ ہے کہ دعا مانگتے ہوئے انسان کی حالت افضل ہو۔ مثلاً سجدے اور رکوع کی حالت۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"خبردار! میں تمہیں رکوع و سجود میں تلاوتِ قرآن سے منع کرتا ہوں، لہٰذا رکوع میں رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں دعا کا اہتمام کرو کیونکہ سجدے میں دعا کی قبولیت کا امکان ہے۔" (صحیح مسلم: 479)

افضل جگہ سے مراد یہ ہے کہ جس جگہ پر انسان دعا کر رہا ہے وہ دوسری جگہوں سے افضل ہو مثلاً حرمین شریفین (بیت اللہ و مسجد نبوی)، مساجد، مکہ مکرمہ وغیرہ۔ یہ ایسے مقامات ہیں جن میں دوسری جگہوں کی نسبت دعا جلد قبول ہونے کا امکان ہوتا ہے، حتیٰ کہ مشرکین مکہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ مکہ کے اندر دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب کفار نے نبی اکرم ﷺ کی پشت پر حالتِ نماز میں اوجھ ڈالی تو (نبی کریم ﷺ نے ان پر بد دعا کی اور) ان پر نبی اکرم ﷺ کی بد دعا گراں گزری

کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شہر مستجاب الدعوات ہے۔" (صحیح بخاری:240)

4۔ افضل وقت میں دعا

جس طرح قبولیتِ دعا کے لیے افضل حالت اور افضل جگہ کا ہونا مستحب ہے، اسی طرح افضل وقت میں دعا کرنا بھی مستحب ہے جیسے عرفہ کے دن یا رمضان المبارک کے مہینے میں دعا کرنا اور اس میں بھی بالخصوص آخری دس دن اور ان دس دنوں میں بھی طاق راتیں اور شبِ قدر زیادہ افضل ہیں۔ اسی طرح سحری کا وقت، جمعہ کا دن، اذان اور اقامت کا درمیانی وقت بھی افضل اوقات میں شامل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«الدُّعَاءُ لَا يُرَدُّ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ»

" اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں ہوتی۔" (مسند احمد:2/155؛ سنن ترمذی:212)

5۔ گریہ زاری اور تکرار کے ساتھ دعا کرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ گڑگڑاتے ہوئے اور بار بار دہراتے ہوئے دعا کرنا۔

جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ يَدْعُوَ ثَلَاثًا وَيَسْتَغْفِرَ ثَلَاثًا»

" اللہ کے رسول ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ تین تین مرتبہ دعا کی جائے اور تین تین مرتبہ استغفار کیا جائے۔" (سنن ابوداود:1524، ضعیف عند الالبانی)

6۔ اسمائے حسنیٰ اور نیک اعمال کا وسیلہ

مستحب آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام لے کر دعا کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلَّـهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا﴾ (سورۃ الاعراف:180)

" اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں تو ان ناموں کے ساتھ اللہ ہی کو پکارا کرو۔"

اسی طرح دعا کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے نیک اعمال کا وسیلہ پیش کرے کہ اے اللہ! میں نے محض تیری رضا کی خاطر فلاں فلاں نیک کام کیا، اے اللہ! مجھے بخش دے۔۔۔ اے میری مصیبت دور فرما۔۔۔ اے اللہ! میرے حال پر رحم فرما۔

7۔ جلد بازی سے پرہیز

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دعا کرنے والا ان شرائط کو مد نظر رکھ کر دعا کرتا ہے لیکن پھر بھی اس کی دعا قبول نہیں ہوتی تو ایسے دعا کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مایوس ہو کر جلد بازی میں اپنی دعا کو چھوڑ نہ دے بلکہ دعا مانگتا رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ فَيَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ فَلَا أَوْ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي»

"بندے کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک وہ جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔"

پوچھا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! جلد بازی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندے کا اس طرح کہنا کہ میں نے دعا کی، پھر دعا کی، لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ پھر وہ دل برداشتہ ہو کر دعا کو چھوڑ دے۔ (یہ جلد بازی ہے۔)"

(صحیح بخاری:6340؛ صحیح مسلم:2735)

قبولیت دعا کی مختلف صورتیں

یاد رہے کہ ہر انسان کی ایسی دعا جو مذکورہ شرائط وآداب کے مطابق کی جائے، وہ قبول ضرور ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

"اور تمہارے رب کا فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔"

لیکن دعا کی قبولیت کی تین مختلف صورتیں ہیں جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَلَا قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللهُ بِهَا إِحْدَى ثَلَاثٍ: إِمَّا أَنْ يُعَجِّلَ لَهُ دَعْوَتَهُ، وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ، وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عنهُ من السُّوءِ مثلَهَا قَالُوْا إذن نُكْثِرَ قال اللهُ أكثَرُ»

"جب بھی کوئی مسلمان ایسی دعا کرے جس میں گناہ یا صلہ رحمی نہ ہو، تو اللہ رب العزت تین باتوں میں سے ایک ضرور اسے نوازتے ہیں، یا تو اس کی دعا کو قبول فرما لیتے ہیں یا اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر دیتے ہیں اور یا اس جیسی کوئی برائی اس سے ٹال دیتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: پھر تو ہم بکثرت دعا کریں گے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا:" اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ بخشنے (عطا کرنے) والا ہے۔" (مسند احمد:3/18)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان دعا کے مذکورہ بالا آداب وضوابط اور شروط وقواعد کو مد نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور دست سوال دراز کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور اس کی دعا قبول فرماتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سائل کو اس کے سوال ومطالبہ سے نواز دے اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور عموماً اسے ہی مقبول دعا کیا خیال جاتا ہے۔

اس صورت کی مزید دو حالتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ادھر دعا کی جائے اور ادھر اسے فوراً قبول کر لیا جائے جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے طلبِ اولاد کی دعا کی:

﴿رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ (سورۃ آل عمران:38)

" اے میرے رب! مجھے تو اپنے پاس سے اچھی اولاد عطا فرما۔"

تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور فرشتوں کے ذریعے انہیں باخبر کیا کہ

﴿ أَنَّ اللَّـهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو حضرت یحییٰ (بیٹے) کی خوشخبری دیتے ہیں۔''

دعامیں قبولیتِ دعا کی دوسری حالت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دعا طویل عرصہ کے بعد قبول ہو جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا﴾

(سورۃ البقرہ:129)

''اے ہمارے رب! ان میں سے رسول بھیج۔''

جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا سینکڑوں برس کے بعد قبول ہوئی اور ابراہیم نے جس رسول کی بعثت کی دعافرمائی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں قبول ہوئی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے ہیں۔

(الفتح الربانی:181/20)

''میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ کا خواب ہوں۔''

جبکہ اس کے علاوہ بھی قبولیت کی دو صورتیں ہیں جنہیں لوگ 'قبولِ دعا' کی فہرست میں شامل نہیں سمجھتے، یعنی سائل کی دعا دنیا میں تو پوری نہیں ہوئی، البتہ اس دعا کو روزِ قیامت اجر وثواب بنا کر سائل کے نامۂ اعمال میں شامل کر دیا جائے گا یا بسا اوقات اس دعا کی برکت سے سائل وداعی سے کسی آنے والی مصیبت کو ٹال دیا جاتا ہے جس کا اندازہ دعا کرنے والے کو نہیں ہو پاتا اور وہ یہی سمجھتا کہ شاید اس کی دعا قبول نہیں ہوئی جبکہ اس کی دعا بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوتی ہے مگر اس قبولیت کی صورت ہمارے خیالات سے کہیں بالا ہوتی ہے۔

بعض اوقات دعا کی جو صورت ہمارے سامنے ہے، اللہ اس سے بہتر صورت میں اس کی تکمیل کر دیتے ہیں اور وہی ہمارے حالات کے زیادہ موافق ومناسب ہوتی ہے، تو یہ بھی قبولتِ دعا کی ایک صورت ہے۔ اس میں بعض اوقات تاخیر ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم اس قبولیتِ دعا کو بظاہر اپنے لیے اچھا خیال نہیں کرتے لیکن وسیع تناظر میں یا دور اندیشی کے طور پر وہی بات ہمارے حق میں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ الغرض آداب وشروطِ دعا کو مدنظر رکھتے ہوئے دعا مانگی جائے تو وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَسْتَجِيبَ اللَّهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ وَالْكَرْبِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِي الرَّخَاءِ»

جس آدمی کی یہ خواہش ہو کہ اللہ تعالیٰ مشکلات اور مصائب میں اس کی دعا قبول کرے، اسے چاہیے کہ خوشحالی کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کیا کرے۔

(جامع ترمذی:3304)

رات کے وقت کسی بھی لمحے آنکھ کھلنے پر ان مسنون الفاظ کے بعد دعا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''جو شخص رات کے وقت بیدار ہوا، اور اس نے یہ کہا:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، الحَمْدُ لِلَّهِ، وَسُبْحَانَ اللَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ»

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، وہ یکتا و تنہا ہے، اسکا کوئی شریک نہیں، ساری بادشاہی اور تعریفیں اسی کیلئے ہیں، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، الحمد للہ، سبحان اللہ، اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، اللہ اکبر، نیکی کرنے کی طاقت، اور برائی سے بچنے کی ہمت اللہ کے بغیر نہیں ہے۔ پھر اس نے کہا: یا اللہ! مجھے بخش دے، یا کوئی اور دعا مانگی تو اسکی دعا قبول ہوگی اور اگر وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز بھی قبول ہوگی۔''

(صحیح بخاری:1154)

حال ہی میں میرے علم میں ایک رسالہ بعنوان 'تبادلہ خیالات' تالیف سید رضا حسین شاہ لایا گیا۔ موصوف کو ایڈ منٹن (شمالی لندن) کے ایک اجتماع احباب میں ماہِ محرم کی مناسبت سے تقریر کے لیے بلایا گیا تھا، جس میں مجھے بھی دعوت خطاب دی گئی تھی۔ مجھے موصوف کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا، میں تو یہی گمان کر رہا تھا کہ موصوف ماہِ محرم کے فضائل کے علاوہ شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر اپنا نقطۂ نظر مفصل طور پر بیان کریں گے لیکن انہوں نے پہلے تو وحی الٰہی کے اسرار و رموز بیان کیے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کرنا شروع کیے اور اس ضمن میں «أنا مدينة العلم وعلي بابها» والی روایت کا شدّ ومدّ سے ذکر کیا۔ اگر موضوع کی مناسبت سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کیے جاتے تو بالکل مناسب تھا لیکن خلفاءِ اربعہ میں سے خصوصی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کا بیان اور جان بوجھ کر اصحاب ثلاثہ (حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم) کے ذکر سے اغراض ہمارے شیعہ ذاکرین کی اس ذہنیت کا غماز ہے جو ہمیشہ سے ان کا وطیرہ رہی ہے۔

ہم اہل سنت کے نزدیک چاروں اصحاب انتہائی تکریم اور احترام کے مستحق ہیں، ہم نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحیح روایات سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں اور نہ ہی اصحابِ ثلاثہ کے مقام علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی شبہ کا شکار ہیں۔ لیکن جہاں تک تحقیق روایات کا تعلق ہے، ہم رسول اللہ ﷺ سے کسی ایسے قول کو منسوب نہیں کر سکتے جو تحقیق واستناد کے لحاظ سے پایۂ ثبوت تک نہ پہنچا ہو اور وہ اس لیے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ فرما چکے ہیں:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا ، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» (صحیح بخاری: 1291، صحیح مسلم: 3)

''جو بھی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے تو وہ آگ میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔''

نہ ہم کسی صحابیٔ رسول بلکہ خود رسول اللہ کی ذات کے بارے میں غلو کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اس بارے میں ہم کسی رواداری کے قائل ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ»

(سنن ابن ماجہ: 3029)

''دین میں غلو (حد سے بڑھ جانے) سے بچو، تم سے پہلے لوگ دین میں اسی غلو کی بنا پر ہلاک ہوئے تھے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنی زندگی میں اس غلو کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ تبھی ان کی زبان سے یہ الفاظ صادر ہوئے:

"هَلَكَ فِيَّ رَجُلاَنِ: مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٌ قَالٍ" (نہج البلاغہ)

''میری نسبت سے دو قسم کے لوگ ہوئے، محبت میں غلو کرنے والا اور نفرت کرنے والا کینہ پرور۔''

افسوس ہے کہ صاحبِ رسالہ نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے تار عنکبوت کا سہارا لیا ہے۔ موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری مباحث میں الجھانا چاہا ہے، بہتر ہوتا کہ وہ اپنے عقائد کو اپنے منتسبین تک محدود رہنے دیتے اور اگر اہل سنت سے خطاب کرنے کا بہت ہی شوق ہے تو پھر ان مسائل کو موضوع خطابت بنائیں جو کہ امت کی عمومی اصلاح، تقویٰ کی تخم ریزی اور دین کی طرف ورغبت دلانے والے ہوں۔

بہر صورت میں اپنی بات ان نکات تک محدود رکھوں گا جو شاہ صاحب نے اپنے مقالہ میں اٹھائے ہیں جو کہ ان چار نکات کے گرد گھومتے ہیں۔

1۔ احادیث کے ذخیروں پر مشتمل کتب میں ایسی کوئی ایک کتاب نہیں پائی جاتی جو موضوع اور جھوٹی حدیثوں سے پاک ہو۔

2۔ روایت «أنا مدينة العلم وعلي بابها» بالکل صحیح اور مستند ہے۔

موصوف نے متقدمین میں سے تیرہ نام ایسے محدثین یا مؤلفین کے گنوائے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور سات نام ایسے حضرات کے ہیں جنہوں نے اپنی کتب میں اس حدیث کو نقل کیا ہے، پھر صوفیا اور شعراء میں سے، چھ حوالے ذکر کیے ہیں، جہاں اس حدیث کا مقام مدح ذکر کیا گیا ہے۔

3۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم کے لحاظ سے تمام صحابہ سے افضل نہیں ہیں۔

اپنے اس ادّعا پر موصوف نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو کوئی دلیل نہیں دی، البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدف بناتے ہوئے کئی ایسے واقعات کتب تفسیر وحدیث سے نقل کیے ہیں جن سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کئی دوسرے صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بعض مسائل میں ٹوکا ہے یا ان کی تصحیح کی ہے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اقرار کیا اور کہا کہ

اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتے۔

4۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم لدنّی وہبی حاصل تھا جبکہ باقی تمام صحابہ کا علم اکتسابی تھا جس میں غلطی کا امکان موجود تھا اور یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی کوئی مسئلہ کسی اور صحابی سے نہیں پوچھا۔ پھر اس ادعاء پر چند ایسی روایات پیش کی ہیں جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بزعم خود اپنی فضیلت ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں یا بعض دوسرے صحابہ ان کی علمیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم لدنّی حاصل ہونے پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اللہ کے رسول رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا والی و وارث ٹھہرایا ہے۔

اب آیئے ان نکات پر تحقیقی گفتگو ہو جائے۔

1۔ مجموعہ احادیث کے بارے میں موصوف کا یہ کہنا کہ انہیں ایسی کوئی کتاب نہیں جو موضوع اور جھوٹی حدیثوں سے پاک ہو تو شیعہ مصادر کی حد تک تو بالکل صحیح ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک حدیث کے قدیم ترین ذخیرے پر مشتمل کتاب 'الکافی' (جس کے مؤلف کلینی ہیں) میں ایسی روایات موجود ہیں کہ جن سے قرآن میں تحریف کا ہونا، قرآن سے علیحدہ مصحف فاطمہ کا ہونا اور دیگر خود ساختہ مزاعم کا ذکر ملتا ہے لیکن اہل سنت کے نزدیک یہ مسلّمہ امر ہے کہ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ (ف256ھ) کی جمع کردہ 'الجامع الصحیح' کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب ہے، جس کے بعد امام مسلم بن الحجاج القشیری رحمہ اللہ (ف261ھ) کی الصحیح ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (ف1176م) کہ جن کا حوالہ موصوف نے اپنے مقالہ میں استناداً دیا ہے وہ کتب احادیث کے چار طبقات کا ذکر کرتے ہیں اور پہلے طبقہ حدیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم کے ساتھ مؤطا امام مالک کا بھی ذکر کرتے ہیں اور دوسرے طبقہ میں سنن ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں صحیح احادیث کا غلبہ ہے لیکن چند ضعیف اور منکر احادیث بھی ہیں کہ جن کی محققین نے نشاندہی کر دی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ (ف279ھ) حدیث ذکر کرنے کے بعد اس کے صحیح، ضعیف، حسن، غریب، شاذ و منکر ہونے کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ قارئ کسی غلط فہمی میں نہ رہے، تیسرے طبقہ میں وہ کتب ہیں جن میں صحیح، ضعیف اور موضوع احادیث سب ملی جلی ہیں اور چوتھے طبقہ میں ضعیف اور موضوع احادیث کا غلبہ ہے اور موصوف کے حوالہ جات اکثر اسی قسم سے متعلق ہیں۔ (اس موضوع پر مزید بحث اگلے نکتہ کے ضمن میں آجائے گی۔)

2۔ موصوف کے مقالہ میں مرکزی بحث روایت (أنا مدينة العلم وعلي بابها) کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں، سے متعلق ہے۔

موصوف 13 سے 20 کتب کے حوالہ جات دے کر اس روایت کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کرنے کے لیے بے چین ہیں اور اس ضمن میں بدظنی پر مشتمل یہ فقرے بھی جڑ گئے کہ جو حضرات اس حدیث کا انکار کرتے ہیں، اصل میں ان کو حدیث کا دوسرا جز پسند نہیں ہے، اگر یہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ کسی اور صحابی کا نام ہوتا تو پھر اس حدیث کا کوئی انکار نہ کرتا۔ (ص17)

جناب عالی! ہمارے نزدیک کسی روایت کے جانچنے کا معیار ہوائے نفس نہیں ہے بلکہ محدثین کے قاعدہ کے مطابق روایت و درایت کے مسلّمہ اصول ہیں، یہاں مسئلہ خلفاء اربعہ کی فضیلت کا نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ سے ایک ایسے قول کو منسوب کرنا ہے جو روایت اور درایت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

موصوف کی طرف سے بجائے بیس کتابوں کے حوالے، اگر صرف یہ ذکر کر دیا جاتا کہ ان حوالہ جات میں قدیم ترین حوالہ جامع ترمذی یا اس سے لگ بھگ مستدرک حاکم (ف405ھ) کا ہے تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ بعد کے جتنے بھی مؤلفین ہیں انہوں نے اپنے دو حوالوں پر اعتماد کیا ہے اور اس لیے اصل کلام حدیث کی ان اسانید کے حوالے سے ہوگا جو ان دونوں محدثین نے ذکر کی ہیں۔

خود موصوف نے سیوطی رحمہ اللہ (ف911ھ) کی جمع الجوامع سے جو سند نقل کی ہے، وہ وہی سند ہے جو امام حاکم رحمہ اللہ اپنی کتاب المستدرک میں نقل کر چکے ہیں۔

اب آیئے پہلے ان محدثین اور ائمہ کے حوالہ جات، جنہوں نے اس حدیث کو موضوع یعنی مَن گھڑت کہا ہے۔

1۔ موصوف کے دیے ہوئے حوالہ جات میں قدیم ترین حوالہ جامع ترمذی کا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

" ہذا حدیث غریب منکر یعنی یہ حدیث غریب (بمعنیٰ روایت شخص واحد) اور منکر ہے یعنی انتہائی ضعیف حدیث ہے۔ اصطلاحاً جس کا راوی بھی ثقہ نہ ہو اور وہ صحیح حدیث کے بھی خلاف ہو۔

2۔ مستدرک حاکم نے اس روایت کو دو سندوں سے بیان کیا ہے اور یہ سند رواۃ کی ترتیب کے لحاظ سے اس طرح ہے۔

الحاکم: ابو العباس محمد بن یعقوب، محمد بن ابراہیم الہَرَوی (رَملَہ سے تعلق ہے)، ابو الصلت عبد السلام بن صالح، ابو معاویہ، الاعمش، مجاہد، ابن عباس، رسول اللہ ﷺ۔

سند پر کلام

اہل علم میں یہ بات معروف ہے کہ المستدرک للحاکم تیسرے طبقہ کی کتب میں سے ہے کہ جس میں صحیح، ضعیف اور موضوع احادیث شامل ہیں۔ اس

لیے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے (ف 748ھ) نے تلخیص کے نام سے الحاکم کی درج شدہ احادیث پر اپنے ریمارکس دینے میں اور ضعیف اور موضوع احادیث کی نشاندہی کی ہے، الحاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیاہے لیکن الذہبی نے صاف صاف لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

اس حدیث کی سند میں تین علتیں ایسی ہیں کہ جن کی بناپر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

1۔ الاعمش (سلیمان بن مہران) کے بارے میں معروف ہے کہ وہ تدلیس کے قائل ہیں (یعنی اپنے غیر معروف شیخ کا نام ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کے معروف شیخ کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ حدیث کی سند بھلی دکھائے دے)

اس حدیث میں وہ مجاہد سے روایت کر رہے ہیں وہ بھی 'عن' کے صیغے کے ساتھ، اسی لیے مدلس کی روایت کو اسی وقت قبول کیا جاتا ہے جب وہ بجائے 'عن' کے 'حدثنا' یا 'حدثنی' کے صیغے کے ساتھ روایت کرے۔

شیخ النجاری لی بن المدینی سے پوچھا گیا کہ الاعمش نے مجاہد سے کتنی حدیثیں سنی ہوں گی تو انہوں نے کہا کہ دس کے قریب، اور کہا کہ مجاہد سے زیادہ تر روایات ابو یحییٰ القتات نے نقل کی ہیں۔

(تہذیب التہذیب)

2۔ دوسری علت یہ ہے کہ اس روایت کو الاعمش سے روایت کرنے والے صرف ایک راوی ہیں اور وہ ہیں ابو معاویہ محمد بن خازم الضریر۔

یہاں شک یوں پیدا ہوتا ہے کہ الاعمش کے معروف اصحاب میں سے یحییٰ القطان، سفیان الثوری اور شعبہ ہیں تو یہ روایت صرف انہی کے واسطہ سے کیوں آئی؟

کہا جاتا ہے کہ یحییٰ بن معین تو ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں، تو خود یحییٰ بن معین نے اعتراف کیا ہے کہ ابن نمیر نے مجھے بتایا کہ ابو معاویہ بہت پہلے کبھی اس حدیث کو بیان کرتے تھے پھر انہوں نے اسے بیان کرنا چھوڑ دیا۔

(روایت ابن محرز: معرفۃ الرجال)

3۔ تیسری علت یہ ہے کہ ابو معاویہ سے روایت کرنے والے عبد السلام بن صالح الہروی ابو الصلت ہیں، حسن کے ضعیف، متروک الحدیث، راوی منکرات، ہونے کے بارے میں تمام کبار محدثین جیسے امام احمد، ابو زرعہ الرازی، النسائی، العقیلی، ابن حبان، ابن عدی، الدار قطنی، ابو نعیم الاصبہانی، محمد بن طاہر، ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم متفق ہیں۔ الذہبی نے الحاکم کے اس قول پر کہ وہ ثقہ اور مأمون ہیں، کہا: نہیں! اللہ کی قسم! نہ وہ ثقہ ہیں، نہ ہی مأمون ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء)

محدثین میں یحییٰ بن معین واحد شخص ہیں جو ان کی توثیق کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس حدیث کی متابعت محمد بن جعفر الفیدی سے ہو جاتی ہے۔ یعنی ابو معاویہ سے روایت کرنے والے صرف عبد السلام نہیں بلکہ یہ دوسرے راوی بھی ہیں۔

ابو الصلت کے بارے میں مروی ہے کہ وہ غنی آدمی تھے، مشائخ کا اکرام واعزاز کیا کرتے تھے اور یوں وہ ان سے احادیث کی روایت کر ڈالتے تھے۔ اس لیے ابن معین کے قول کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کی ابی معاویہ تک سند درست ہے، یہ نہیں کہ یہ حدیث بذاتِ خود صحیح ہے۔

الذہبی لکھتے ہیں کہ "یہ بات معروف ہے کہ دلوں میں اس شخص کی محبت رچ بس جاتی ہے جو کسی پر احسان کرے، یہ (یعنی عبد السلام) یحییٰ سے بہت حسن سلوک کرتے تھے، ہم یحییٰ بن معین کی امامت کے قائل ہیں، رجال کے بارے میں ان کے اقوال کو مانتے ہیں الّا یہ کہ ثابت ہو جائے کہ وہ کسی ضعیف راوی کی توثیق میں منفرد نظر آئیں۔"

(سیر اعلام النبلاء)

دوسری سند جس میں ابو الصلت نہیں ہے اور جسے الحاکم نے پہلی سند کا شاہد ٹھہرایا ہے وہ ایسے ہے:

ابو بکر محمد بن علی الفقیہ الامام، النعمان بن ہارون، احمد بن عبد اللہ بن یزید الہُثیمی المؤدب، عبد الرزاق، سفیان الثوری، عبد اللہ بن عثمان بن خُثیم، عبد الرحمٰن بن بہمان التیمی، جابر بن عبد اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

(أنا مدينة العلم وعلي بابها فمن أراد العلم فليأت الباب)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس پر لکھتے ہیں:

"قلت: العجب من الحاكم وجرأته في تصحيحه هذا وأمثاله من البواطيل وأحمد هذا دجال كذاب."

"تعجب ہے حاکم کی اس جرأت پر کہ وہ اس قسم کی باطل روایات کو صحیح قرار دے رہا ہے جب کہ اس حدیث کا ایک راوی احمد بن عبد اللہ بن یزید بہت ہی بڑا جھوٹا شخص تھا۔" (المستدرک: 3/127)

بطورِ خلاصہ عرض ہے کہ یہ حدیث چار صحابہ یعنی ابن عباس، علی بن ابی طالب، جابر بن عبد اللہ اور ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہم سے منسوب کی گئی ہے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جابر رضی اللہ عنہ سے منسوب احادیث کی سند کا بیان ہو گیا ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہی روایت مختلف کتب حدیث میں دوسری اسانید سے تھی، روایت کی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی روایت صحت کے درجہ تک نہیں پہنچتی۔

1۔ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت لے لیتے ہیں، جو جامع ترمذی میں نقل کی گئی ہے، اس کی سند یوں ہے:

اسماعیل بن موسیٰ الفزاری، محمد بن عمر الرومی، شریک بن عبد اللہ النخعی، سلمہ بن کہیل، سوید بن غفلہ، الصنابحی، علی رضی اللہ عنہ۔

اس روایت میں بھی محمد بن عمر الرومی ضعیف راوی ہیں اور ایسے ہی ان کے شیخ شریک بن عبد اللہ کا حال ہے۔ الحافظ ابن حجر ؒ نے ان کے بارے میں کہا: "سچے ہیں لیکن بہت غلطیاں کرتے ہیں، جب سے کوفہ کے قاضی بنے، ان کے حفظ میں خلل آ گیا، ویسے وہ انصاف کرنے والے، علم وفضل کے حامل، عبادت گزار اور اہل بدعت کے بارے میں بڑے سخت تھے۔" (التقریب)

خود امام ترمذی ؒ نے اس روایت کے بارے میں یہ الفاظ کہے:

"شریک کے اپنے ساتھیوں سے کسی ثقہ راوی نے اس حدیث کو بیان نہیں کیا، ان کے شیخ سلمہ بن کہیل سے سوائے ان کے کسی اور نے اسے روایت نہیں کیا۔"

امام ترمذی ؒ نے امام بخاری ؒ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اسے منکر قرار دیا۔ (العلل الکبیر)

محدثین کا قاعدہ ہے کہ اگر راوی ضعیف ہو (جیسے شریک کا ذکر ہوا) اور پھر ایک روایت میں منفرد ہو تو وہ اس حدیث کو قبول نہیں کرتے۔

الصنابحی کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے چند راوی اور بھی ہیں، الاَصبغ بن نباتہ اور الحارث الاَعور، اور یہ دونوں راوی سخت ضعیف ہیں۔

اہل بیت میں سے حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور علی بن موسیٰ الرضی کی روایات بھی نقل کی گئی ہیں لیکن دونوں کی اسانید میں سخت کلام کیا گیا ہے۔

اور یہی حال عامر الشعبی، عبد اللہ بن ابی رافع، جریر الضبی کی روایات کا ہے، جن میں سے کوئی بھی پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچتی۔

اب آیئے چوتھی روایت کی طرف جو حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے منسوب کی گئی ہے۔

یہ ایک غیر معروف مصنف ابن شاذان نے اپنی کتاب (مائۃ منقبہ) میں نقل کی ہے۔

اس کے راوی میں ابن شاذان (دجال کذاب)، اس کا شیخ محمد بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن الهلول (دجال، کذاب، حدیث گھڑنے والا)، پھر اس کے شیخ کا شیخ عیسیٰ بن مہران (کذاب، منکر احادیث کا راوی، رافضی) اور پھر اس کے شیخ کا شیخ خالد بن طہمان الکوفی (ضعیف، موت سے دس سال پہلے اختلاط ذہنی کا شکار) قرار دیا گیا ہے، ہم نے اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے نقاد حدیث کی پوری عبارتیں درج نہیں کی ہیں لیکن راویوں کے بارے میں یہ ساری آراء تہذیب الکمال للمزی، الکامل لابن عدی اور تقریب التہذیب لابن حجر، میزان الاعتدال للذہبی میں دیکھی جا سکتی ہیں اور پھر نتیجہ کلام کے طور پر ہم ان محدثین کے نام اور ان کی مختصر آراء درج کیے دیتے ہیں، جنہوں نے اس حدیث کو موضوع یعنی من گھڑت قرار دیا ہے۔

متقدمین میں سے چند محدثین اور ائمہ کے اقوال ملاحظہ ہوں:

یحییٰ بن معین: جھوٹی روایت ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ (معرفۃ الرجال، روایت ابن محرز)

امام احمد، ابو حاتم اور یحییٰ بن سعید ؒ نے بھی ایسی ہی بات کہی ہے۔

امام بخاری ؒ: یہ منکر روایت ہے۔ بالکل صحیح نہیں ہے۔

امام ترمذی ؒ: غریب اور منکر ہے۔

امام ابو زرعہ ؒ: کتنے ہی لوگ اس روایت میں رسوا ہوئے ہیں۔

امام دار قطنی (م385ھ) ؒ: ثابت نہیں ہے، اس کا راوی رافضی ہے، خبیث ہے۔

ابن دقیق العید ؒ: محدثین نے اسے ثابت قرار نہیں دیا۔

امام نسائی ؒ: اس کا راوی ثقہ نہیں ہے۔

امام نووی ؒ: باطل ہے۔

امام ابن حبان ؒ (ف 354ھ): اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

یہاں تک پہلی چار صدیوں کے محدثین اور ائمہ کے اقوال کا خلاصہ پیش خدمت تھا۔

امام ابن الجوزی ؒ (ف 597ھ) نے اپنی کتاب (الموضوعات) میں اس کی اسانید پر مفصل کلام کیا ہے اور اس روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ چند اور ائمہ کے اقوال بھی ملاحظہ ہوں:

ابن طاہر المقدسی (م507ھ) ؒ: من گھڑت ہے۔

امام ابن تیمیہ ؒ کا کلام کچھ شرح وبسط کے ساتھ ملاحظہ ہو:

"یہ حدیث انتہائی ضعیف اور کمزور ترین ہے، گو امام ترمذی ؒ نے اسے روایت کیا ہے لیکن اس روایت کا شمار موضوع احادیث میں سے ہوتا ہے۔ امام ابن جوزی ؒ نے اس کے سارے طرق پر کلام کیا ہے۔

اس کی عبارت سے جھوٹ خود چھلکتا نظر آ رہا ہے اور وہ یوں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ نبی ﷺ علم کے شہر ہیں اور پھر اس کا ایک ہی دروازہ ہے، اور صرف ایک شخص ہی اس کا علم کا راوی ہے، تو پھر دین اسلام تو فساد کا شکار ہو گیا، اور اس لیے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ایسا جائز نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ سے علم کی تبلیغ کرنے والا صرف ایک فرد واحد ہو، بلکہ ان کی تعداد تو تواتر کی حد تک ہونی چاہیے تاکہ ان کی دی گئی اخبار مرتبہ علم (یقین) تک پہنچ جائیں۔"

پھر کہا کہ تمام بلادِ اسلامیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی علم پہنچا ہے۔ اہل مکہ اور مدینہ کی بات تو ظاہر ہے (کہ وہاں اکثر صحابہ رہے)

یہی حال شام اور بصرہ کا بھی ہے، وہاں بھی اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے تو بہت تھوڑی سی، ان کا غالب علم سرزمین کوفہ میں رہا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ خود کوفہ میں حضرت

عثمان ؓ کی وفات سے قبل قرآن و سنت کا علم پھیل چکا تھا۔ (منہاج السنہ بتحقیق د/ محمد رشاد سالم)

اہل مدینہ کے فقہاء خلافت حضرت عمر ؓ کے دوران دین کو خوب سمجھتے تھے، سیدنا معاذ ؓ نے اہل یمن میں علم کو پھیلایا اور وہ وہاں حضرت علی ؓ سے زیادہ مقیم رہے اور اسی لیے اہل یمن حضرت علی ؓ اور قاضی شریح اور اکابر تابعین میں سے زیادہ حضرت معاذ بن جبل ؓ دین کی سمجھ حاصل کرتے نظر آتے ہیں، حضرت علی ؓ جب کوفہ آئے تو ان سے پہلے وہاں قاضی شریح موجود تھے، انہوں نے اور عبیرہ السلمانی نے حضرت علی ؓ کے علاوہ دوسروں سے علم حاصل کیا، حضرت علی ؓ کے کوفہ وارد ہونے سے قبل مدائن اسلام میں علم پھیل چکا تھا۔

(مہاج السنہ بتحقیق، د/ محمد رشاد سالم: 515-516)

متاخرین میں سے چند نام اور ملاحظہ ہوں، جنہوں نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

امام ابن حجر ؒ، جنہوں نے تقریب التہذیب میں اس روایت کے راویوں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ الذہبی (748ھ)، سیر اعلام النبلاء، میزان الاعتدال سیوطی (911ھ)، مؤلف کتاب اللآلی المصنوعہ۔

السخاوی (902ھ): المقاصد الحسنۃ

نور الدین ابی الحسن السمہووی (911ھ): الغماز علی اللماز

محمد بن طاہر علی ہندی (984ھ): تذکرۃ الموضوعات

الشوکانی (1250ھ): الفوائد المجموعۃ

العجلونی (1162ھ): کشف الخفاء

ابن عراق الکنانی (963ھ): تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الأخبار الشنیعۃ الموضوعۃ

محمد ناصر الدین الالبانی (1420ھ/ 1999ء): ضعیف الجامع الصغیر

مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض محدثین اور علماء جیسے الحاکم، ابن حجر، ابو سعید العلائی رحمہم اللہ نے اس روایت کو قابل استناد سمجھا ہے لیکن اس کی تمام اسانید میں کذّاب اور متہم راویوں کی موجودگی کے بعد ان علماء کی تحسین پر قطعاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

موصوف نے چھ صوفیا اور شعراء کے اقوال اور منظوم کلام کو بھی پیش کیا ہے۔

علم حدیث میں محدثین کے کلام کو قابل استناد سمجھا جاتا ہے، شعراء اور صوفیہ کا نہیں، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے علم طب میں اطباء کے بجائے فلاسفر کے قول کو حجت سمجھا جائے یا علم عروض و قوافی میں مناطقہ کا قول پیش کیا جائے۔

3۔ حضرات شیخین کے بارے میں موصوف کا یہ فرمانا کہ وہ صحابہ میں علم کے لحاظ سے سب سے افضل نہیں ہیں اور یہ کہ حضرت علی ؓ کا علم بہت زیادہ تھا، ایسا دعویٰ ہے کہ شواہد اسی کے مخالف ہیں۔

ابن حزم ؒ نے اس ادّعا کا مسکت جواب دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"ایک صحابی کا علم دو طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ تیسرا کوئی طریقہ نہیں:

اول: کثرت روایات اور کثرت فتاویٰ

دوم: اللہ کے رسول ﷺ کا کثرت سے انہیں عامل (گورنر) بنانا۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ایسے شخص کو عامل بنائیں جسے کوئی علم نہ ہو، اس کا عامل بنایا جانا اس کے علم اور توسع پر دلیل ہے۔ ہم نے اسی پہلو پر غور کیا تو دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بیماری کے دوران حضرت ابو بکر ؓ کو نماز پڑھانے کے لیے مقرر کیا، حالانکہ تمام اکابر صحابہ بشمول حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہم موجود تھے۔ ایک غزوہ کے وقت آپ ﷺ نے حضرت علی ؓ کو اپنا نائب بنایا لیکن یہ عورتوں اور معذور افراد کی دیکھ بھال کے لیے تھا، تو یہ بات ضرورۃً ثابت ہوئی کہ جب حضرت ابو بکر ؓ کو نماز پڑھانے کے لیے مقرر کیا تو حضرت ابو بکر ؓ نماز اور نماز کے تمام احکامات کے سب سے زیادہ عالم ہوئے اور ان تمام حضرات سے بھی جن کا ذکر ہوا اور وہ اس لیے کہ نماز دین کا ستون ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے زکاۃ کی تحصیل پر بھی حضرت ابو بکر ؓ کو مقرر کیا، تو معلوم ہوا کہ انہیں صدقات وزکاۃ کے بارے میں بھی وہی علم حاصل ہے جو علماء صحابہ میں سے دوسروں کو حاصل تھا نہ کہ ان سے کم۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ زکاۃ نماز کے بعد دوسرا اہم رکن اسلام ہے اور ہماری بات کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر ؓ سے وارد زکاۃ کے بارے میں احادیث سب سے صحیح ترین روایات ہیں کہ جن پر عمل کرنا واجب ہے اور جن کی مخالفت نہیں کی جا سکتی، ان کے بعد وہ احادیث ہیں جو کہ سیدنا عمر ؓ سے مروی ہیں لیکن سیدنا علی ؓ سے مروی روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے اور اس لیے ان سے مروی روایت میں یہ کہا گیا کہ پچیس (25) اونٹوں میں زکاۃ کی پانچ بکریاں واجب ہوتی ہیں۔

اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو بکر ؓ کو حج پر بھی امیر بنا کر بھیجا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ تمام صحابہ سے زیادہ حج کے احکام کا علم رکھتے تھے، حج بھی دین اسلام کا عظیم رکن ہے۔

اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر ؓ کو مختلف غزوات میں بھی ویسے ہی انہیں امیر بنا کر بھیجا جیسے کئی دوسرے صحابہ بشمول سیدنا علی ؓ کو بھیجا تھا تو معلوم ہوا کہ سیدنا ابو بکر ؓ کے پاس جہاد کے احکام کا اتنا علم تو ضرور تھا جتنا سیدنا علی ؓ یا دوسرے امراء غزوات کے پاس تھا، تو معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر ؓ نماز، زکاۃ، حج میں حضرت

علی رضی اللہ عنہ پر فائق ہیں اور احکام جہاد میں ان کے برابر ہیں۔

(الفصل فی الملل والاھواء والنحل:4/212-214)

اب کچھ تذکرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہو جائے۔

موصوف نے چند واقعات ذکر کیے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ نے چند مسائل میں انہیں ٹوکا تھا یا ان کی تصحیح کی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ موصوف اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے تبادلہ خیال نہیں کرتے تھے؟ کیا ان میں سے ہر شخص تعلّی کا شکار تھا کہ وہ دوسرے کے علم سے استفادہ نہ کرے؟ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کتنے ہی صحابہ کے علم پر استدراک کیا ہے۔ الزرکشی رحمہ اللہ نے بعنوان (الإجابة لإيراد ما استدركته عائشة على الصحابة) ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس میں ان مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کئی دوسرے صحابہ سے اختلاف رائے کیا تھا۔

یہی کچھ حال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ہے لیکن انہیں یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مسائل کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا اور پھر ان کی خواہش کے مطابق وحی نازل ہوئی۔ ایسے واقعات کو موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ جیسے مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کی خواہش کا اظہار اور پھر اس امر پر مشتمل وحی اترنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بار بار خمر (شراب) کے بارے میں اللہ کے رسول سے بیان شافی کی درخواست کرنا اور پھر شراب سے اجتناب کرنے کا حکم کا نازل ہونا اور ایسے ہی ان کا ازواج مطہرات کے حجاب کے سلسلہ میں درخواست کرنا اور پھر حجاب کے بارے میں آیات کا نازل ہونا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں صرف چند روایات ذکر کرتا ہوں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ» (جامع ترمذی، مسند احمد)

"اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔"

« اقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي : أَبُو بَكْرٍ ، وَعُمَرُ» (جامع ترمذی، متدرک الحاکم)

"پیروی کرو میرے بعد ان دو حضرات کی: ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما۔"

«كَانَ عُمَرُ أَعْلَمَنَا بِكِتَابِ اللهِ، وَأَفْقَهَنَا فِي دِينِ اللهِ، وَأَعْرَفَنَا بِاللهِ» (الہیثمی، مجمع الزوائد)

"ہم سب میں عمر اللہ کی کتاب کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے، ہم سب میں وہ دین کی سب سے زیادہ سمجھ رکھتے تھے اور ہم میں سب سے زیادہ اللہ کو پہچانتے تھے۔"

انہوں نے یہ بھی کہا:

"اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ جائے اور تمام اہل زمین کا علم دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو ان کا پلڑا بھاری ہو جائے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موت پر کہا:

"میں گمان کرتا ہوں کہ یہ شخص علم کے دس حصوں میں سے نو حصے لے کر چلا گیا ہے۔"

(مجمع الزوائد)

زید بن وہب کہتے ہیں کہ ایک شخص کو معقل بن مقرن ابو عمیرہ نے ایک آیت پڑھائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ آیت ایک دوسرے شخص کو پڑھائی۔ دونوں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس کی قراءت کے مطابق پڑھائیں تو انہوں نے پہلے شخص سے پوچھا: تمہیں کس نے پڑھایا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: ابو عمیرہ معقل بن مقرن نے، پھر دوسرے سے پوچھا: تمہیں کس نے پڑھایا تھا؟ اس نے جواب دیا: سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے۔"

یہ سن کر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے، کافی دیر تک آنسو بہتے رہے، پھر کہا: "ایسے ہی پڑھو جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمہیں پڑھایا ہے کیونکہ وہ ہم میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کے قاری تھے اور ہم میں سب سے زیادہ اللہ کے دین کو جاننے والے تھے۔ (بروایت ابن بطہ)

ابن بطہ اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ لکھتے ہیں کہ جس کے راوی عبد خیر ہیں۔

"میں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عصر کی نماز پڑھی۔ اہل نجران دو صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو ایک شخص نے دوسرے شخص کو اشارہ کیا تو اس نے ایک خط نکال کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر آبدیدہ ہو گئے اور پھر اپنا سر اٹھا کر کہا: اے اہل نجران! (یا اے میرے اصحاب!) یہ میرے ہاتھ کا تحریر کردہ اپنا خط ہے جس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے املاء کروایا تھا۔ انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! جو اس میں ہے، ہمیں بھی عطا ہو۔"

تو میں نے اپنے ایک قریبی ساتھی سے کہا، اگر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ردّ کرنے والے ہوئے تو آج کریں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ایسی کسی چیز کا ردّ نہیں کر سکتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو نہیں دیا وہ اس سے بہتر تھا جو تم سے لیا، اور جو تم سے لیا وہ اس سے بہتر تھا جو نہیں دیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے اگر کچھ لیا تو اپنے نفس کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ جماعت مسلمین کے فائدے کے لیے تھا۔ (بحوالہ تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی: ص 213)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "اگر مجھے کسی کی یہ بات پہنچی کہ وہ مجھے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا ہے تو میں اسے مفتری (بہتان باندھنے والے) کی سزا یعنی کوڑے ماروں گا۔"

(فضائل الصحابہ: 1/83؛ تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ص 101، میں اس سے مشابہ کلمات ہیں۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پر کہا: "اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔" (صحیح البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی، سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ نے بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر ایک اور شخص۔"

تو ان کے بیٹے محمد بن الحنفیہ نے کہا: اور پھر آپ؟ اے میرے والد! تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

"ما أبوك إلا رجل من المسلمين."

"تمہارا باپ تو مسلمانوں میں سے ایک فرد ہے۔"

(بحوالہ کشف الخفاء: 237/1)

شریف رضی جامع نہج البلاغہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت نقل کیا ہے:

"لله بلاء فلان فقد قوّم الأود، وداوى العمد، خلّف الفتنة، وأقام السنّة، ذهب نقي الثوب قليل العيب، أصاب خيرها، وسبق شرّها، أدى إلى الله طاعته، وأتقاه بحقّه" (نہج البلاغہ: 222/2)

"اللہ فلاں کی محنت قبول کرے، یہ وہ شخص ہے جس نے جماعت کو کھڑا کر دیا، کمزوری کا علاج کیا، فتنے کو مار بھگایا، سنت کو قائم کیا، گیا تو صاف ستھرا ہو کر گیا، عیب اس کے قلیل تھے۔ اپنے زمانے کے خیر کو خوب سمیٹا اور شر کو پیچھے چھوڑ گیا، اللہ کی اطاعت کو خوب نبھایا اور اس سے ڈرنے کا حق ادا کر دیا، کوچ کر گیا لیکن جماعت کو ایسی راہداریوں میں چھوڑ گیا کہ گم کردہ راہ، راستہ نہیں پا رہے اور ہدایت یافتہ بھی یقینی حالت میں نہیں۔"

موصوف نے تین واقعات سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم میں کوتاہ تھے اور نہ صرف صحابہ بلکہ ایک صحابیہ نے بھی آپ کو ٹوکا۔

جواباً عرض ہے کہ اہل سنت نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ صحابہ، بشمول خلفاء اربعہ، غلطی سے مبرّا ہیں، ان سے شریعت کا کوئی مسئلہ او جھل نہیں۔

لاریب جب کہ ایک عورت نے مہر کی رقم مقرر کرنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوکا اور پھر قرآن سے دلیل بھی پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو شرحِ صدر کے ساتھ تسلیم کیا۔

حق کی طرف رجوع کرنا ایک فضیلت ہے اور حاکم وقت اگر ایسا کرے تو یہ اس کے لیے باعث صد افتخار ہے۔ کاش کہ ہر دور میں حکام اس صفت کو اپنا سکیں، وہ عورت جسے ناجائز حمل کے سلسلہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سزا دینا چاہتے تھے، اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صائب مشورہ دیا تھا اور بحیثیت مشیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرض تھا کہ وہ ایسا مشورہ دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول فرمایا جو کہ ان کی جلالت قدر پر دلالت کرتا ہے۔

قدامہ بن مظعون کے بارے میں موصوف نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ تفاسیر کی کتب میں مختلف انداز سے مروی ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اتنا ذکر کیا ہے کہ قدامہ پر حجت قائم کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سوال کیا تھا کہ اسے کتنے کوڑے مارے جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ شراب پینے والا بہک جاتا ہے اور بہکنے والا انسان ہذیان بکتا ہے اور ہذیان بکنے والا بہتان باندھتا ہے، اس لیے میری رائے ہے کہ ایسے شخص کو بہتان باندھنے کی سزا یعنی اسّی (80) کوڑے مارے جائیں۔

(بحوالہ سنن الدار قطنی)

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے اسے سزا کو نافذ کر دیا اور صرف اسی ایک واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہے تھے:

"لَوْ لَا عَلِيٌّ لَـهَلَكَ عُمَرُ" "اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کے مابین انتہائی مشفقانہ تعلقات تھے اور یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان کے مشورہ پر عمل کرنا خود ان کی اپنی قدر و منزلت کی نفی نہیں کرتا۔

قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں ہُد ہُد پرندے کا ذکر کیا ہے جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہتا ہے:

﴿أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ﴾ (النمل: 22)

"میں نے تو اس چیز کا احاطہ کر لیا ہے جس کا تم نہ کر سکے اور میں سبأ سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے خضر سے یہ الفاظ کہتے ہیں:

﴿ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ (الکھف: 66)

"کیا میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تم مجھے ہدایت کی وہ باتیں بتاؤ جو تمہیں سکھائی گئی ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلفاء ثلاثہ کا مشیر ہونا خود ان کے لیے باعث اعزاز ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس ترتیب سے خلفاء اربعہ کا ظہور ہوا وہ نہ صرف ایک قدرتی ترتیب تھی بلکہ خلفاء کے مراتب افضلیت کو بھی ظاہر کرتی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ اول تھے تو ان کے مشیر حضرت عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم جیسے لوگ تھے، اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بمع دوسرے فضلاء صحابہ، ان کے مشیر رہے، اور یوں خلافتِ اسلامیہ کو وہ عروج اور ترقی حاصل ہوئی جو کہ اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انہیں ایسے مشیر نہ حاصل ہو سکے اور ان کا مختصر عہد خلافت جنگ و جدال کی نذر ہو گیا۔ (جاری ہے)

عَنْ أَمِيرِ الْمُؤمِنِينَ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ.

سلیس ترجمہ: ”سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”عملوں کا اعتبار نیتوں سے ہے اور آدمی کے واسطے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس کی ہجرت اللہ اور رسول کے واسطے ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لیے ہے اور جس کی ہجرت دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے۔“

شرح: کتاب الطھارۃ: لفظ کتاب كَتَبَ يَكْتُبُ سے مصدر ہے اس کا مادہ 'ک ت ب' ہے۔ کتاب بمعنی مکتوب یعنی لکھی ہوئی چیز مراد ہے۔ لغت میں اس کا ایک معنی لشکر بھی ہے کتاب بھی الفاظ اور حروف کے لشکر (مجموعہ) سے بنتی ہے۔

قران وحدیث میں لفظ کتاب کئی ایک معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

① لکھے ہوئے پیغام کے لیے:

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کے واقعے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ﴿اِذْهَب بِّكِتَابِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ﴾ (النمل:28) یہ میری کتاب (لکھا ہوا پیغام) لے جاؤ اور ان کی طرف پھینک کر آو۔

② فرض کے معنی میں:

جیسے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (النساء:103) ”بے شک نماز مومنوں پر وقت مقررہ پر فرض ہے۔“

③ حکم کے معنی میں:

جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ایک قضیہ میں فرمان ہے: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُما بكِتَابِ اللهِ» ”کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تم دونوں میں اللہ کی کتاب (حکم) کے مطابق فیصلہ کروں گا۔“

④ موت کے معنی میں

﴿وَمَآ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلاَّ وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ﴾ (الحجر:4) ”اور ہم نے کسی بستی (والوں) کو ہلاک نہیں کیا مگر ان کی موت کا وقت مقرر تھا۔“

⑤ تقدیر اور قضا کے معنی میں

﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (الانفال:68) ”اگر اللہ کی تقدیر میں یہ نہ ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا ہے اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔“

⑥ عقد مالی کے معنی میں

﴿وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (النور:33) ”اور جو غلام تم سے مکاتبت یعنی مالی معاہدہ کرنا چاہیں تو اگر تم ان میں صالحیت اور نیکی پاؤ تو ان کے ساتھ معاہدہ کر لو۔“

⑦ قران مجید کے معنی میں

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ﴾ (النساء:105) ”بے شک ہم نے اپ کی طرف سچی کتاب یعنی قرآن مجید اتارا۔“ اور ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ (البقرۃ:2) ”اس کتاب یعنی قران مجید میں کوئی شک نہیں۔“

⑧ تورات، انجیل اور آسمانی کتب کے معنی میں

﴿قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ....﴾ (الانعام:91) ”کہہ دیجیے کہ کس نے کتاب یعنی تورات جو موسیٰ علیہ السلام لائے اتاری جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔“

⑨ لوح محفوظ اور اعمال نامہ کے معنی میں

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ﴾ (الکھف:49) ”اور نامہ اعمال (ہر کسی کے سامنے) رکھ دیا جائے گا پس آپ دیکھیں گے کہ مجرم ڈر رہے ہوں گے جو اس میں ہے۔“ ﴿كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا...﴾ (الجاثیۃ:28) ”ہر گروہ کو اس کے اعمال نامہ کی طرف بلایا جائے گا۔“

⑩ عورت کی عدت کے معنی میں

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ...﴾ (البقرۃ:235) ”اور نکاح کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔“

اس کے علاوہ بھی لفظ کتاب کئی ایک معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

الطھارۃ: لفظ طہارت طَهَرَ يَطْهُرُ سے مصدر ہے لغوی طور پر میل کچیل اور گندگی کو دور کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اور اصطلاح میں حدث اور نجاست و پلیدی سے پاکیزگی حاصل کرنے کو کہتے

ہیں۔

حدث: "جس حالت سے انسان کو وضوء یا غسل کرنا پڑے اس کو حدث کہتے ہیں۔"

طہارت کی دو قسمیں ہیں:

① معنوی ② حسی

① **طہارت معنوی:** یہ ہے کہ دل کو شرک کی غلاظتوں سے مکمل پاک کرے اور عقیدہ توحید کو اپنے دل و دماغ میں بسائے اور اسی طرح دل کو اخلاقی برائیوں جیسے حسد، بغض، کینہ، ریا، تکبر سے پاک کرے اور اپنے دل کو اخلاقی محاسن اور فضائل سے مزین کرے۔

② **حسی طہارت:** پانی سے وضوء، غسل یا تیمم کرنا یا کسی بھی چیز سے نجاست و گندگی کو دور کرنا مثلاً جسم، کپڑا، زمین اور جانوروں کی کھال وغیرہ۔

اسلامی اعتبار سے طہارت ایک جامع لفظ ہے جو ہر طرح کی پلیدگی و گندگی کو دور کر کے پاکیزگی اور صفائی حاصل کرنے کا نام ہے، مثلاً اپنے دل، دماغ، زبان اور باقی اعضاء وغیرہ کو ظاہری صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنا اور نافرمانی سے بچنا طہارت ہے۔

اسلام میں طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلطَّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ» (صحیح مسلم، ترمذی، نسائی اور مسند احمد وغیرہ)

"کہ طہارت نصف ایمان ہے۔"

امام تقی الدین ابو محمد المقدسی نے عمدۃ الاحکام کی ابتدا کتاب الطھارۃ سے کی اور اس کتاب میں 7 باب اور 43 احادیث لائے پہلے باب میں 10 احادیث بیان کیں اس سے طہارت و پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور کتاب الطھارۃ میں پہلی حدیث وہ ذکر کی جس میں معنوی طہارت کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ معنوی طہارت ظاہری اور حسی طہارت پر مقدم اور افضل ہے۔

حدیث سے اخذ ہونے والے مسائل

① اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے درست نیت کے بغیر عمل قبول نہیں ہے اور نیت کی درستگی اخلاص ہے۔

نیت لغت میں ارادے کو کہتے ہیں اور شریعت میں عبادت کے فعل کو خالص اللہ کی رضا کے لیے کرنے کے پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔

② نیت کا محل دل ہے اور اس کو زبان سے ادا کرنا بدعت ہے سوائے حج و عمرہ کی نیت کے۔

③ سب سے بڑا عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔

④ بلاد کفر و شرک سے بلاد اسلام کی طرف ہجرت کرنا افضل عبادات میں سے ہے بشرطیکہ نیت اللہ کی رضا ہو۔

⑤ ریاکاری سے عمل کا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

تین سخت ترین کام

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

" أشد الأعمال ثلاثة : الجود من قلة ، والورع في خلوة ، و كلمة الحق عند من يرجى و يخاف . "

"تین کام سب سے سخت (مشکل) ہیں: تنگ دستی کے باوجود سخاوت کرنا، تنہائی میں پرہیز گاری اختیار کرنا، اور اس کے سامنے کلمہ حق کہنا جس سے خوف یا کسی چیز کی امید ہو۔"

(المنتظم: 10/137)

ہر مصیبت و آزمائش عذابِ الٰہی نہیں!

مولانا نثار احمد حصیر قاسمی

اس دنیا میں کسی بھی انسان کو دائمی غم نہیں ملتا، بلکہ کبھی غم ہے تو کبھی خوشی، کبھی درد والم ہے تو کبھی فرحت و مسرت، کبھی بیماری ہے تو کبھی صحت، کبھی تفکرات والجھنیں ہیں تو کبھی بے فکری وانبساط، کبھی تنگی ہے تو کبھی آسودگی، کبھی سکون ہے تو کبھی بے چینی، کبھی سردی ہے تو کبھی گرمی، کبھی امن ہے تو کبھی بدامنی، کبھی تکلیف ہے تو کبھی راحت۔ یہ سلسلہ ہر فرد بشر کے ساتھ لگا ہوا ہے، کوئی اس سے خالی نہیں، مگر بسا اوقات کسی دَرد والم، مصائب ومشکلات اور پریشانیوں والجھنوں کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے تو وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ساری دنیا کی مصیبتیں اسی کے لیے مختص کر دی گئی ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ہیں، جو مصائب ومشکلات اور الجھنوں وپریشانیوں کے لامتناہی سلسلہ سے بہت بددل ہو جاتے ہیں کہ ان کی زندگی مصیبتوں اور آزمائشوں کا مجموعہ بن گئی ہے، کہ ایک مصیبت سے چھٹکارہ نہیں ملتا کہ دوسری مصیبت حملہ آور ہو جاتی ہے، ایک پریشانی دور نہیں ہوتی کہ دوسری اس سے بڑی پریشانی گھیر لیتی ہے۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی قسمت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ اس میں کبھی شاید ہنسی خوشی نہیں، شاذ ونادر ہی کبھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ تیرتی اور مسرت کے لمحات سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ انہیں یہ دائمی احساس ستاتا رہتا ہے کہ یہ مصائب وآلام، یہ مشکلات وپریشانیاں اور یہ آزمائش وآفات وبلائیں شاید اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں سزا دینے کے لیے ہیں۔ انہیں یہ سزائیں ان کے گناہوں ومصیبتوں کے پاداش میں دی جارہی ہیں، جس کا انہوں نے دانستہ یانادانستہ ارتکاب کیا ہے، یازندگی کے کسی موڑ اور کسی لمحے میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا عمل کیا ہے جس کی سزا انہیں ان مصیبتوں کی شکل میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اس احساس کی وجہ سے ان کی مصیبتوں میں اور بھی شدت پیدا ہو جاتی اور ان کا درد اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا یہ احساس نفسیاتی بیماری وتکلیف میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتا اور اس کے اندر سے ان مشکلات سے نبرد آزما ہونے ومزاحمت کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مؤمن ہونے کے ناطے غلطیوں وگناہوں پر ندامت اور اس کا احساس اچھی بات ہے بلکہ ہر مؤمن کو اپنی کوتاہیوں کو ٹٹولنا اور معصیتوں پر نظر رکھنا چاہیے اور اللہ سے اس کی معافی مانگنی چاہیے اور توبہ واستغفار کے ذریعہ اللہ سے عفو ودرگزر کی درخواست کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کا خواستگار ہونا چاہیے مگر اس کے بعد اسی فکر میں پڑے رہنا اور مایوسی کا شکار ہونا درست نہیں بلکہ توبہ ومعافی کے بعد اللہ تعالیٰ سے بہتر امید رکھنی چاہیے۔ احساس ندامت ضمیر اور ایمان کی موجودگی کی علامت ہے اور ہر انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو دھلا دھلایا ہوا نہ سمجھے، گناہوں سے پاک وصاف تصور نہ کرے بلکہ یہ سمجھے کہ «كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ» "ہر اولاد آدم خطاکار ہے، مگر اس میں سب سے بہتر خطاکار وہ ہے جو توبہ والا (اور اللہ سے معافی مانگنے والا اور اپنی غلطیوں پر اترانے والا) نہ ہو۔"

توبہ کے بعد اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے، مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کا یہ سمجھنا کہ اس کے مصائب ومشکلات، ابتلاء وآزمائش، بیماری ودکھ اور حوادث وآفات اللہ کی جانب سے سزا ہے اور ہر پریشانی اس کے گناہوں کی وجہ سے ہے، یہ درست نہیں بلکہ یہ پریشانیاں اکثر وبیشتر انسانوں کو مانجھنے اور اس کے درجات کو بلند کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "لوگوں میں سب سے زیادہ بلائیں، مصیبتیں اور آزمائش انبیاء کو پہنچتے ہیں، پھر نیک وصالح لوگوں کو پھر جو ان سے زیادہ مشابہت رکھنے والے ہوتے ہیں۔"

اگر انسان کے ایمان میں سختی وپائیداری ومضبوطی ہوتی ہے، تو اس کی آزمائش بھی زیادہ سخت ہوتی ہے اور اگر ایمان کمزور ہوتا ہے، اس میں سختی ومضبوطی نہیں ہوتی تو اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں سب سے زیادہ اور سب سے سخت آزمائش کس کی ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "انبیاء کی، پھر صالحین کی، پھر جو ان کے مثل اور ان سے مشابہت رکھنے والے ہوتے ہیں، انسانوں کی آزمائش ان کے ایمان کے بقدر کی جاتی ہے، اگر اس کے دین میں سختی ورسوخ ہوتا ہے تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کے دین (ایمان) میں خفت ہوتی ہے تو اس کی آزمائش ہلکی کر دی جاتی ہے اور بندوں کی آزمائش کی جاتی رہتی اور اسے طرح طرح کے مصائب ومشکلات میں مبتلا کیا جاتا رہتا ہے یہاں تک وہ روئے زمین پر اس طرح چلتا پھرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی خطا ومعصیت باقی نہیں رہتی۔"

(مسند احمد بن حنبل، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

«وَإِنَّ اللَّهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ»

"اللہ جب کسی قوم کو چاہتا اور پسند کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈالتا ہے، بندہ جب اس پر راضی رہتا

ہے تو اللہ اس سے راضی وخوش ہو جاتا ہے اور بندہ اگر اس پر ناراض ہوتا اور خفگی کا اظہار کرتا ہے تو اللہ اس سے ناراض وخفا ہو جاتا ہے۔" (سنن ترمذی، بسند صحیح)

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض بیماری، پریشانی، آزمائش، حزن وملال اور رنج والم، سزا وعقاب نہیں بلکہ سزا وعقاب اس آزمائش پر صبر نہ کرنے میں ہے، یہاں تک کہ اگر مصائب و آزمائش میں اس طرح گھرا ہو کہ یقین سے کہا جا سکتا ہو کہ یہ اس کے گناہ کی سزا ہے اور اسے بطور عقاب اس میں مبتلا کیا گیا ہے تو بھی اسے عذاب الٰہی سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔

مثال کے طور پر کوئی ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور ڈاکٹروں نے اس کی وجہ حرام وناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم کرنے کو بتایا اور شہوت پرستی وزناکاری وبدکاری کو اس کا سبب قرار دیا تو بھی یہ عذاب نہیں بلکہ آزمائش وامتحان ہے۔ اگر بندہ یہ تصور کرلے تو اس سے اس کی تکلیف ہلکی ہو جائے گی، یہ اس وجہ سے کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب اور وہاں کی سختی سے بہت ہلکی وآسان ہے۔ یہاں کی سزا روح کو پاک کرنے اور بندے پر رحم وکرم کرنے کے لیے ہے تاکہ بندہ اس کے بعد گناہ سے پہلے جس طرح تھا اس سے زیادہ بہتر طریقہ پر پاک وصاف ہو جائے، پہلے وہ اللہ سے جتنا قریب تھا اس سے زیادہ قریب ہو جاتا، پہلے جتنا صاف تھا اس سے زیادہ صاف ہو جاتا اور نکھر جاتا ہے، پہلے جتنا پرہیز گار تھا اس سے زیادہ متقی وپرہیز گار ہو جاتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ جب اپنے بندہ کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دنیا ہی میں جلدی سزا دے دیتا ہے اور اگر اللہ اپنے بندے کے ساتھ خیر کرنا نہیں چاہتا تو اس کے گناہوں کے باوجود اس سے دست کش رہتا ہے (اس کی گرفت نہیں کرتا) پھر قیامت کے دن اس کا اسے بدلہ دیتا ہے۔" (سنن ترمذی، بسند صحیح)

تو جلدی کرتے ہوئے دنیا ہی میں سزا دینے کو اللہ کی جانب سے خیر کا ارادہ قرار دیا گیا ہے۔ اسے غضب الٰہی اور عذاب قرار نہیں دیا گیا۔ بیماری ہو یا ناکامی اس کے اسباب ہوتے ہیں اور اکثر وبیشتر اس کا علم ہوتا ہے۔ اس کائنات میں یہ سلسلہ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ ہر نتیجہ کا ایک نہ ایک سبب ہوتا ہے اور یہ نظام کائنات ہر ایک کے لیے برابر ہے خواہ مؤمن ہو یا کافر۔ ایسا نہیں کہ میٹھی چیز کھانے سے کافر کا شوگر تو بڑھے گا مؤمن کا نہیں، ٹینشن اور بڑے کے گوشت اور نمک کی زیادتی سے کافر کا بلڈ پریشر تو ہائی ہوگا مؤمن کا نہیں، سخت گرمی میں چل کر آتے ہی فریج کا برفیلا پانی پینے سے گناہ گار کی طبیعت تو خراب ہوگی نیکوں کی نہیں، ایسا نہیں ہے، یہ نظام کائنات ہر ایک کے لیے یکساں ہے اور ہر چیز کا ایک سبب ہے۔ ہر کوئی بیماری میں مبتلا ہوتا حادثات سے دوچار ہوتا اور ناگہانی صورتحال کا سامنا کرتا ہے، اس میں کمی اور زیادتی احتیاط کرنے یا نہ کرنے سے ہوتی یا اسباب کو اختیار کرنے یا نہ کرنے سے ہوتی، البتہ یہی چیزیں مؤمن کے لیے کفارہ سیئات، گناہوں کو دھونے کا ذریعہ اور کبھی ترک درجات کا سبب بنتے ہیں۔ مؤمن ان آزمائشوں کے اندر گناہوں کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ سے اچھی امید بھی کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اسی طرح خوف ورجاء کے درمیان رہتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ ہم کس طرح فرق کر سکتے ہیں کہ کونسی بیماری اور کونسی مصیبت آزمائش ہے اور کونسی سزا ابلائیں ہیں، تو اہل علم نے اس کے بارے میں ایک ضابطہ بیان کیا ہے کہ آزمائش کی گھڑی اور بیماری وغیرہ میں بندہ اگر صبر کرتا، حوصلہ مند رہتا اور اللہ کی تقدیر پر راضی رہتا ہے تو اس پر جزع وفزع نہیں کرتا، واویلا نہیں مچاتا اور اللہ سے بدگمانی کا اظہار نہیں کرتا اور نہ ہی نامناسب کلمات اپنی زبان پر لاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار ہوتا، مغفرت کی دعائیں کرتا اور اللہ کی طرف جھکتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی یہ بیماری اس کے درجات کو بلند کرنے اور اس کی خطاؤں کو معاف کرنے اور اس کے گناہوں کا کفارہ بنانے کے لیے ہے اور اگر بندہ اس پر جزع فزع کرنے لگتا، چیخ وپکار شروع کر دیتا، بددل ومایوس ہو جاتا، اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا، زبان سے نامناسب کلمات نکالنے لگتا اور واویلا مچاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرنے لگتا ہے اور شر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے، تو یہ محرومی وخسارے کی علامت اور سزا کی نشانی ہے۔

ہمیں مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ ہمیں مصائب وآلام اور ابتلاء وآزمائش کی گھڑی میں کس طرح رہنا چاہیے، اس آزمائش سے کس طرح نمٹنا اور سوچنا اور طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، ہمیں منفی انداز اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ منفی طرز عمل بندے کو اللہ سے دور کر دیتا ہے، ایسا نہ ہو کہ بیماری کی شدت میں ہماری زبان سے یہ نکل جائے کہ میں ہی اس بیماری یا آزمائش کے لیے رہا تھا، اللہ نے میرے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا، یا اس طرح کی باتیں۔ آزمائش میں بلاشبہ بندہ مؤمن کے لیے خیر ہی خیر ہے بشرطیکہ ہم اسے خیر بنائیں اور اس کو خیر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس پر صبر کریں، اللہ سے مدد طلب کریں، دعائیں کریں اور پہلے سے زیادہ اللہ کے سامنے گڑگڑائیں اور عاجزی کا اظہار کریں۔ حدیث کے اندر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَجَبًا لأمرِ المؤمنِ إنَّ أمْرَه كُلَّهُ لهُ خَيرٌ وليسَ ذلكَ لأحَدٍ إلا للمُؤْمنِ إنْ أصَابتهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فكانتْ خَيرًا لهُ وإنْ أصَابتهُ ضَرَّاءُ صَبرَ فكانتْ خَيرًا لهُ»

"ایمان والوں کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا پورا معاملہ خیر ہی خیر ہے یہ صرف ایمان والوں کی بات ہے، اگر اسے خوشی وکشائش حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر بجالاتا ہے تو یہ اس کے لیے

خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف ومصیبت پہنچتی ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر وبہتر ہے۔" (صحیح مسلم)

غم واندوہ، حزن وملال، رنج وتکلیف ایک چیلنج ہے جس کا ہمیں سامنا ہوتا ہے۔ جو ہماری انرجی کو ضائع کرتا اور ہمارے اندر تحریک پیدا کرتا ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان چیلنجوں کا سامنا کریں، مایوسی وقنوطیت کا شکار نہ ہوں، وساوس اور منفی خیالات کو درآنے کا موقع نہ دیں بلکہ حوصلہ کے ساتھ ان حالات کا اور ناگفتہ بہ صورتحال کا مقابلہ کریں اور اللہ سے خیر کی امید رکھیں اور اللہ کو یاد کرتے رہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّـهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ "اللہ کے ذکر سے دل کو اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے۔"

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہو، ہر کوئی کسی نہ کسی آزمائش میں ضرور رہتا ہے اگرچہ اس کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ﴾

"یقیناً ہم تمہارا امتحان لیں گے تاکہ تم میں جدوجہد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کردیں اور ہم تمہاری حالتوں کی بھی جانچ کرلیں۔"

(محمد:31)

جس بندے کے اندر مؤمنانہ روح کار فرما ہوتی، وہ اپنے خالق سے مربوط ہوتا اور اپنے پروردگار سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ خود کو حالات سے ہم آہنگ کرتا اور حالات سے متاثر ہوکر نروس نہیں ہوتا، خواہ یہ حالات کتنے ہی کٹھن اور اندوہناک کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّـهِ ۗ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّـهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّـهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

" اور جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔"(التغابن:11)

انسان سمجھتا ہے کہ اسے جو کچھ پہنچا ہے اللہ کی مشیت اور اس کے حکم سے ہی پہنچا ہے تو وہ صبر اور رضا بالقضاء کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سید ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "اس کا مطلب ہے کہ اللہ اس کے دل میں یقین راسخ کردیتا ہے جس سے وہ جان لیتا ہے کہ اس کو پہنچنے والی تکلیف اس سے چوک نہیں سکتی اور جو اس سے چوک جانے والی ہے وہ اسے پہنچ نہیں سکتی۔"

(تفسیر ابن کثیر)

اسی یقین وایمان کے ساتھ ابتلاو آزمائش انسان کے لیے شفا اور عافیت ثابت ہوتی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم ان حالات میں صبر سے کام لیں، اللہ سے مدد طلب کریں اور اللہ ہی سے اسے دور کرنے کی درخواست کریں اور اس سے نجات کے لیے دربدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔

☆☆☆

امام ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"ما مِن عمل صالح إلا و الذِّكر مشترطٌ في تصحيحه. فمن لم يذكر الله بقلبه عند صَدقته ، أو صيامه مثلاً ، فليس عمله كاملاً، فصار الذِّكر أفضل الأعمال من هذه الحَيثية ."

" تمام نیکی کے کاموں کی تصحیح کے لیے ذکر شرط ہے، مثلاً جو صدقہ اور روزے کے وقت اپنے دل سے اللہ کا ذکر نہ کرے اس کا عمل کامل نہیں، پس اس اعتبار سے ذکر سب سے افضل عمل ہے۔"

(فتح الباری:11/210)

امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"عباد الله تَعَاهَدُوا الصَّلَاة على حبيبنا مُحَمَّد صلى الله عَلَيْهِ وَسلم لِأَن الله تَعَالَى إِذا أَرَادَ بِعَبْدِهِ خيرا يسر لِسَانه للصَّلَاة على مُحَمَّد صلى الله عَلَيْهِ وَسلم."

"اللہ کے بندو! اپنے حبیب ﷺ پر درود کو لازم پکڑو، کیونکہ جب اللہ بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی زبان پر درود کو جاری و ساری کردیتا ہے۔"

(بستان الواعظین:1/300)

ص: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ٹ: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ص: آپ کا پیدائشی نام کیا ہے؟

ٹ: میرا نام Thierry (ٹیری) ہے۔

ص: مسلمان ہونے کے بعد کیا نام رکھا؟

ٹ: میں نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر نام شرکیہ یا خلاف شرع نہ ہو تو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا نام ایک فرانسیسی کلمہ ہے جس کا معنٰی 'طاقت ور' ہے۔ اس لیے میں نے کلمہ پڑھنے کے بعد اسے باقی رکھا ہے۔

ص: تو کیا آپ کا تعلق فرانس سے ہے؟

ٹ: جی ہاں! میرا اصل وطن فرانس ہے اور وہیں میں پلا بڑھا ہوں اور برطانیہ میں 2011 سے مقیم ہوں۔

ص: آپ کی عمر کیا ہے؟

ٹ: میری عمر بتیس (32) سال ہے۔

ص: اسلام کب قبول کیا تھا؟

ٹ: تقریباً دس سال قبل اسلام قبول کیا تھا جب میری عمر بائیس سال تھی۔

ص: یعنی جب آپ فرانس میں تھے، تبھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

ٹ: جی ہاں

ص: کیا آپ کے والدین یا بہن بھائیوں میں سے بھی کوئی مسلمان ہے؟

ٹ: نہیں! میرے دو بھائی اور ایک بہن ہے، مگر سبھی غیر مسلم ہیں۔

ص: آپ کی تعلیم اور پیشہ کیا ہے؟

ٹ: میری تعلیم بنیادی سی ہے اور بطور پیشہ ایک گودام میں ملازمت کرتا ہوں۔

ص: اللہ تعالیٰ آپ کے رزق میں برکت دے۔

ٹ: آمین، بارک اللہ فیک

ص: چلیے، اصل بات کی طرف آتے ہیں، اسلام کی طرف آپ کا سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

ٹ: اسلام کی طرف سفر کی داستان کچھ یوں ہے کہ میں بچپن ہی سے مذہب کے ساتھ منسلک رہا، والدین بالخصوص والدہ کے ساتھ باقاعدگی سے چرچ جایا کرتا تھا اور وہاں کی مذہبی عبادت ورسومات میں بھی شرکت کرتا تھا مگر یہ سب کچھ لکیر کا فقیر بن کے کرتا تھا، یعنی بغیر سوچے سمجھے۔ جب عقل کچھ پختہ ہوئی اور میں بیس (20) سال کی عمر کو پہنچا تو اپنے مذہبی رجحان کے باعث بائبل کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اب تک جو کچھ کرتا آیا ہوں، اس کی وجوہات اور فوائد سے باخبر ہو سکوں۔ مگر معاملہ اس وقت کچھ بگڑنے لگا جب بائبل کی بہت سی چیزیں میری سمجھ میں نہ آئیں اور بہت سی باتیں خلاف عقل محسوس ہونے لگیں۔ اسی دوران میرا واسطہ ایک مسلمان سے پڑ گیا جو میرا شریک کار تھا اور دین دار بھی۔ مذہبی ذہنیت کے حامل ہونے کے باعث ہم ایک دوسرے سے مختلف امور پہ گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ جب کبھی کسی مسئلے پہ بات کرتے ہوئے اسلام کا حوالہ دیتا اور اسلامی نقطۂ نظر بیان کرتا تو اس کی گفتگو میرے دل کو لگتی اور میرا مَن اسے بڑی وسعت سے قبول کرتا۔ رفتہ رفتہ میں نے اسلام کے بارے میں پڑھنا اور سننا شروع کر دیا مگر ساتھ ہی ساتھ بائبل کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بائبل اور قرآن کا تقابل کرنے کی ٹھان لی۔ مگر اس وقت میری ذہنی کشمکش کی حد نہ رہی جب مجھے پتہ چلا کہ قرآن پوری دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کا ایک ہی ورژن ہے جس کی دنیا میں مختلف زبانوں میں ترجمانی کی گئی ہے جبکہ بائبل کے بہت سے ورژنز ہیں اور بے شمار تراجم بھی۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس حوالے سے میرے ساتھ ایک واقعہ بھی پیش آیا جسے میں اس وقت تو نہ سمجھ سکا مگر بعد میں وہ کئی بار یاد آیا بلکہ اب بھی یاد آتا ہے۔ وہ یہ کہ جب میں نے ابتداء میں بائبل کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا (جبکہ ابھی اسلام سے واقفیت نہ تھی) تو میں پیرس شہر کے مرکز میں لگے ایک بک سٹال پہ بائبل لینے گیا۔ سٹال پہ ایک خاتون موجود تھی، میں نے اس سے کہا کہ مجھے بائبل چاہیے، اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کون سی بائبل؟ پروٹسٹنٹ والی، کیتھولک والی یا کوئی اور؟ سچی بات ہے میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا بلکہ میرے علم میں یہ بات پہلی بار آئی تھی کہ بائبل کئی طرح کی ہے کیونکہ اس سے قبل تو میں والدین کی اندھی تقلید میں ہی مذہب سے وابستہ تھا۔ بہر کیف میرے پاس بائبل کا جو نسخہ تھا میں نے قرآن کے ساتھ اس کا تقابل کرنا شروع کر دیا۔ اس تقابل نے مجھے شدید الجھن میں ڈال دیا کہ ایک طرف قرآن کی ایک ایک بات میرے دل کو بھاتی اور دوسری طرف خاندانی اور نسلی عیسائی مذہبی لگاؤ مجھے اپنے شکنجے سے نہ نکلنے

دیتا۔ ایک سال سے زائد عرصہ اسی ذہنی الجھاؤ میں گزرا۔

ص: پھر اس پیچیدگی کا حل کیا نکلا؟

ٹ: اللہ تعالیٰ جس شخص کی ہدایت کا فیصلہ کر دیں، اس کے لیے راستے بھی کھول دیتے ہیں، میں نے احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ جنوبی افریقہ کے باسی اور تقابل ادیان کے نامور عالمی شہرت یافتہ مبلغ تھے) کی ویڈیوز دیکھنا شروع کر دیں، جن میں سے ایک

"The Quran Or The Bible which is God's Word"

(قرآن یا بائبل: اللہ کا کلام کون سا ہے؟) تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے قرآن اور بائبل کا تقابل اس خوبصورت اور عمدہ انداز سے کیا تھا کہ میرے ذہن میں موجود تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات مجھے مل گئے تھے۔ پھر میں نے ان کی کچھ مزید ویڈیوز بھی دیکھیں جن سے میرے اطمینان قلب میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میرے علم کے مطابق غیر مسلموں بالخصوص عیسائیوں کے سوالات کے مسکت جوابات کے لیے ان کی تقاریر اور مناظرے بے حد مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

ص: پھر آپ نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کب کیا؟

ٹ: احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ کی ویڈیوز دیکھنے کے بعد اسلام کی حقانیت کے بارے میں کوئی شک تو نہیں رہ گیا تھا، مگر آباؤ واجداد کے دین کا طوق اور موروثی روایات کا پھندا گلے سے اتارنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ عرصہ اس کشمکش میں رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج خاندانی دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کروں اور پھر کل اس پہ پچھتاؤں۔ بالآخر جب ضمیر مطمئن ہو گیا اور انکار کی کوئی راہ نہ بچی تو خود ہی ایک روز پیرس کی ایک مسجد میں جا کر امام صاحب سے کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا دیجیے۔ انہوں نے میری درخواست قبول کی اور کلمہ پڑھا کر حلقہ بگوش اسلام کر دیا۔ الحمد للہ

ص: اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا؟

ٹ: کوئی خاص نہیں، بہن بھائی تو ویسے ہی مذہب سے لاتعلق ہیں، اس لیے انہیں میرے قبول اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ تاہم والدہ شروع میں ناراض ہوئیں اور پریشان بھی بلکہ انہوں نے مجھے دوبارہ سے عیسائی بنانے کی کوشش بھی کی اور وہ اس طرح کہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ چرچ لے کے گئیں تاکہ میں پادری کی گفتگو سن کے شاید اس سے متاثر ہو جاؤں مگر ان کی کوشش بالکل بے سود تھی۔

ص: آپ نے مسلمان ہونے کے بعد مزید دین کیسے سیکھا؟

ٹ: ایک تو ذاتی مطالعہ سے اور دوسرے ڈاکٹر بلال فلپس (جو کہ کینیڈین نژاد نَو مسلم عالمی مقرر اور کتب کثیرہ کے مؤلف ہیں۔ آپ پیس ٹی وی انگلش کے اولین مقررین میں سے بھی ہیں) کی تقاریر سے۔ یوں کہیے کہ مسلمان ہونے سے قبل احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ اور بعد میں ڈاکٹر بلال فلپس سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسان ان دونوں شخصیات کو تعصب اور ہٹ دھرمی سے بالاتر ہو کے سن لے تو اسلام سے متعلق تمام ناجائز شبہات دور ہونے کے ساتھ ساتھ دین کو اچھی طرح سمجھ بھی سکتا ہے۔

ص: آپ ہمارے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ٹ: میرا پیغام یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا احتساب کرنا چاہیے اور اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ جس طرح زندگی گزار رہا ہے کیا وہ درست سمت پہ چل رہا ہے کیونکہ اکثر وبیشتر لوگ آنکھیں بند کر کے لاشعوری میں غلط سمت چل رہے ہوتے ہیں اور انہیں اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ بسا اوقات اس میں بڑوں کی تقلید اور کلچر کی نخوت بھی کارفرما ہوتی ہے۔ اسی چیز نے مجھے ایک عرصہ تک اسلام قبول کرنے سے روکے رکھا تھا اور یہی چیز اب میری والدہ کے قبول اسلام میں رکاوٹ ہے۔ میں انہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور وہ میری باتوں سے اتفاق بھی کرتی ہیں مگر 'بڑوں کا دین' چھوڑنا انہیں بہت مشکل نظر آتا ہے۔

ص: اللہ تعالیٰ انہیں بھی ہدایت نصیب فرمائے۔

ٹ: آمین

ص: آخری سوال آپ سے یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان آپ کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟

ٹ: میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ مسلمان رنگ ونسل کی تفریق مٹا کر متحد ہو جائیں، جب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہوں اور ان کے باہمی اتفاق واتحاد، پیار محبت اور رواداری کے واقعات سنتا ہوں تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش! میں بھی زندگی میں ایسی فضا اور ایسا ماحول دیکھ پاؤں۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو متحد فرما دے۔

ص: آمین۔ بہت بہت شکریہ

☆☆☆

بعض لوگ سادے لوگوں کے دلوں سے حدیث سے محبت اور اہمیت کم کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ حدیث اور چیز ہے اور سنت اور۔

اور یہاں تک کہنے کی جرأت کر جاتے ہیں کہ سنت تو دین ہے مگر حدیث دین نہیں ہے۔۔۔

آیئے اس سے متعلق درست منہج کو جانتے ہیں۔

اہل علم کے نزدیک لفظ سنت ایک جامع لفظ ہے اس کے کئی ایک معانی ہیں ان میں سے ایک 'الطریقہ المسلوکہ' یعنی ایسا راستہ جس پر چلا جائے کا ہے۔ اس مفہوم میں سنت سے مراد پورا دین ہے۔

قرآن مجید اور حدیث میں یہ لفظ اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے مجرموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ﴾

"کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے، پہلی قومیں بھی اسی سنت (روش، عادت) پر چلی آ رہی ہیں۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ملعون لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو پکڑ لو اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دو اور فرمایا کہ یہ اللہ کی سنت (طریقہ) ہے۔

﴿سُنَّةَ اللَّـهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّـهِ تَبْدِيلًا﴾

"گزشتہ لوگوں میں اللہ کی یہی سنت (طریقہ) جاری رہی ہے اور آپ اللہ کی اس سنت (طریقہ) میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔"

اسی طرح صحیح بخاری میں لفظ سنۃ الجاھلیۃ استعمال ہوا ہے:

«أبغضُ الناس إلى الله ثلاثة: ملحدٌ في الحرم، ومبتغٍ في الإسلام سنةَ الجاهلية، ومطَّلبُ دم امرئٍ بغير حقٍّ ليُهَرِيقَ دمه»

"جو لوگ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ناپسند ہیں ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی سنت (طریقہ) تلاش کرتا ہے۔"

اسی طرح یہ لفظ بدعت کے مقابلے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

الوجیز فی اصول الفقہ الاسلامی میں سنت کی مبحث میں سنت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے،

"تعريف السنة لغة: هي الطريقة والعادة، حسنة كانت أم سيئة."(القاموس المحيط:4/236)

ومنه قوله تعالى:﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا﴾ [الإسراء: 77] ومنه قول رسول الله ﷺ: «من سنَّ في الإسلام سُنّة حسنة فله أجرُها وأجرُ من عَمِل بها من بعده من غير أن يَنْقُصَ من أجورهم شيء، ومن سَنَّ في الإسلام سُنة سيئة كان عليه وزرُها ووزرُ من عَمِلَ بها من بعده من غير أن يَنْقص من أوزارهم شيء.» (رواه مسلم عن جرير، ورواه الترمذي والنسائي وابن ماجه) ، ومن قوله ﷺ : «لتتبِعُنَّ سنَنَ من كانَ قبلكم شِبرًا بشِبرٍ وذِراعًا بذراع» (رواه الشيخان عن أبي سعيد الخدري)

تعريف السنة اصطلاحًا: عرف علماء الأصول السنة بأنها: "ما نقل عن رسول ﷺ من قول أو فعل أو تقرير." (إرشاد الفحول: 33)

فالسنة إما أن تكون قولية أو فعلية أو تقريرية. (الوجيز في أصول الفقه الإسلامي المبحث الثانى فى السنة الشريفة: ص185)

"عربی لغت کی مشہور اور مستند کتاب القاموس المحیط میں سنت کا لغوی معنی طریقہ اور عادت، اچھا ہو یا برا بیان ہوا ہے۔ اور اسی لغوی معنی پر صاحب کتاب الوجیز فی اصول الفقہ نے دلیل قران مجید کی یہ آیت مبارکہ دی ہے، "ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے ان میں یہی ہماری سنت (طریقہ) رہی ہے اور ہماری اس سنت (طریقہ) میں آپ تبدیلی نہیں پائیں گے۔"(سورہ بنی اسرائیل:77)

اور اسی لغوی معنی پر حدیث رسول ﷺ کا ایک ٹکڑا پیش کیا کہ "جس نے اسلام میں آ کر اچھی سنت (یعنی طریقہ وغیرہ) جاری کی اس کے لئے اپنے عمل کا بھی ثواب ہے اور جو لوگ عمل کریں (اس کی دیکھا دیکھی) ان کا بھی ثواب ہے بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا کچھ ثواب گھٹے اور جس نے اسلام میں آ کر بری سنت (چال، طریقہ، عادت وغیرہ) ڈالی اس کے اوپر اس کے عمل کا بھی بار ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے بعد عمل کریں بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا بار کچھ گھٹے۔" (صحیح مسلم کتاب العلم:1017 اور ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ)

اور سنت کے اسی لغوی معنی طریقہ و عادت کے متعلق یہ حدیث رسول بھی بیان کی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تم لوگ پہلی امتوں کی سنتوں (طریقوں) کی قدم بقدم پیروی کرو گے۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اور سنت کا اصطلاحی معنیٰ بیان کرتے ہوئے کہا کہ علماء اصول (فقہ) کے نزدیک سنت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہے چاہے وہ قول ہو، فعل ہو یا تقریر (تقریر کا معنی یہ ہے کہ کسی صحابی نے آپ کے سامنے کوئی عمل کیا یا بات کہی اور آپ ﷺ اس پر خاموش رہے یا اس کو درست کہا) پس سنت قولی، فعلی اور تقریری ہو سکتی ہے۔

سنت اور حدیث دونوں ایک معنیٰ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

تعريف السنة عند (المحدِّثين)

محدثین کے نزدیک سنت کی تعریف:

ما أُثِرَ عن النَّبي ﷺ من قولٍ، أو فِعْلٍ، أو تقريرٍ، أو صِفةٍ خَلْقِيَّةٍ، أو سِيرةٍ سواء كان قبل البعثة أو بعدها (السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي، د.مصطفى السباعي: 47)

"سنت ہر اس چیز (حکم) کو کہتے جو نبی ﷺ سے ماثور ہو آپ کے قول، فعل، تقریر، صفت خلقی (پیدائشی)، یا سیرت سے چاہے وہ بعثت سے پہلے کی ہو یا بعد کی ہو۔"

"وهذا التَّعريف للسُّنة - عند المحدِّثين - ينطبق تماماً على الحديث، فهُما مترادفان، يُوضع أحدهما مكان الآخر." (السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي:ص47)

"محدثین کے نزدیک سنت کی یہ تعریف حدیث پر پورے طریقے سے منطبق ہوتی ہے پس یہ دونوں (سنت اور حدیث) مترادف لفظ ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے۔"

محدثین کے نزدیک ہر حدیث سنت ہے اور ہر سنت حدیث ہے۔

تعريف السُّنة عند (الأصوليين):

ما صُدر عن النَّبي ﷺ غير القرآن الكريم، من قولٍ أو فِعلٍ أو تقريرٍ، مِمَّا يصلح أن يكون دليلاً لِحُكمٍ شرعي. [الإحكام في أصول الأحكام، علي بن محمد الآمدي:227/1) ؛ إرشاد الفحول إلى تحقيق علم الأصول، محمد بن علي الشوكاني: 29)

"اصول فقہ کے علماء کے نزدیک سنت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو قرآن مجید کے علاوہ نبی کریم ﷺ سے آئی ہو آپ کے اقوال، افعال، تقریرات سے جو حکم شرعی پر دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو یعنی صحیح یا حسن درجے کی ہو۔ (تقریر اس چیز (حکم، بات، عمل) کو کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے سامنے کسی نے کوئی بات کہی یا عمل کیا اور آپ نے اس کو درست کہا یا آپ خاموش رہے)"

تعريف السُّنة عند (الفقهاء)

كلُّ ما ثبت عن النبي ﷺ، ولم يكن فرضاً أو واجباً؛ كالمندوب والمُستحب والتَّطوع والنَّفل. (إرشاد الفحول إلى تحقيق علم الأصول، محمد بن علي الشوكاني: 33)

"فقہاء کے نزدیک سنت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نبی ﷺ سے ثابت ہو اور وہ فرض و واجب نہ ہو۔"

سب سے جامع اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے وسعت والی سنت کی تعریف محدثین کی ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ سنت حجت ہے اور حدیث حجت نہیں باطل اور فضول قول ہے۔ صحیح حدیث اسی طرح دین و شریعت ہے جس طرح قران مجید دین وشریعت ہے۔ واللہ اعلم

☆☆☆

وہ زندیق ہیں!!!

امام ابوزرعہ الرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اگر کسی کو دیکھو کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی تنقیص کرتا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ وہ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن ہمارے نزدیک حق ہے اور ہم تک قرآن کو پہنچانے والے یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کی شہادت کو مجروح قرار دیں تاکہ کتاب وسنت باطل ہو جائے، حالانکہ ان پر جرح مقدم ہے کیونکہ وہ زندیق ہیں۔"

(الکفایہ از خطیب بغدادی: ص97)

عکرمہ بن ابی جہل کے ایمان لانے پر رسول اکرم ﷺ کا فرطِ مسرت سے استقبال فرمانا!

جب عکرمہ مکہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا، عکرمہ بن ابی جہل بہت جلد ایک مؤمن ومہاجر کی حیثیت سے تمہارے پاس پہنچنے والا ہے اس کے باپ کو بُرا مت کہنا، مردے کو بُرا کہنے سے زندہ کو اذیت پہنچتی ہے اور میت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عکرمہ اپنی بیوی ام حکیمؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں پہنچ گیا، آپ ﷺ اُسے دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور چادر کے بغیر ہی اس کے استقبال کے لیے لپکے پھر جب آپ ﷺ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو عکرمہ نے کھڑے کھڑے عرض کیا، محمد (ﷺ)! اُم حکیمؓ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، حضور نے جواب دیا: اس نے صحیح کہا ہے، تم مامون ہو۔" اس نے دوبارہ سوال کیا، اے محمد (ﷺ)! آپ مجھے کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت وپرستش نہیں ہے اور اس بات کی کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اس بات کی کہ تم زکوۃ دو، آپ ﷺ نے ارکان اسلام گنائے، اس عکرمہ نے کہا، بخدا آپ نے حق کی دعوت دی اور خیر کا حکم، بخدا اسی دعوت سے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور نیکوکار تھے، یہ کہہ کر اس نے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا! اس روز سے مسلمانوں کی جماعت میں ایک ایسے شخص کا اضافہ ہوا جو میدان کارزار میں ایک شیر دل شہسوار اور مسجدوں میں ایک عابد شب زندہ دار اور قاری قرآن تھا وہ قرآن کریم کو اپنے چہرے پر رکھ کر خدا کے خوف سے روتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہتے، کتاب ربی... کلام ربی.

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے جو عہد کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے قبول اسلام کے بعد کفر واسلام کے مابین جو بھی معرکہ پیش آیا، اس میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوئے اور مسلمان جب بھی کسی مہم میں نکلے، اس میں آگے آگے رہے۔ معرکہ یرموک میں تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ میدان قتال میں اس طرح لپکے تھے جیسے کوئی تشنہ لب شدید گرمی میں ٹھنڈے میٹھے پانی کی طرف لپکتا ہے، جب فضائے یرموک پر سے جنگ وقتال کے بادل چھٹے اور مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کا آفتاب طلوع ہوا تو یرموک کی زمین پر تین مجاہد زخموں سے چور پڑے ہوئے تھے اور وہ تھے حضرت حارث بن ہشام، حضرت عیاش بن ربیعہ اور حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم ۔ شدت تشنگی سے بے تاب حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پانی مانگا جب پانی ان کو پیش کیا جارہا تھا، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف دیکھا ، حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پہلے ان کو پانی پلانے کا اشارہ کیا اور جب پانی ان کے پاس لے جایا گیا تو حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا کہ پہلے ان کی پیاس بجھائی جائے اور جب پانی پلانے والے ان کے قریب گئے تو دیکھا کہ وہ اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں، جب وہ پلٹ کر دونوں صحابیوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ بھی آبِ کوثر سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں۔

(صور من حیاۃ الصحابہ، تالیف: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا، زندگیاں صحابہ کی مترجم، ابو جاوید اقبال احمد قاسمی)

رسول اکرم ﷺ کا اُم ایمن سے مزاح فرمانا

حضرت زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ اُم ایمن نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ آپ ﷺ کو میرا شوہر بلاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا، تیرا شوہر وہی تو نہیں جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، ان کی آنکھیں تو اچھی ہیں، ان میں سفیدی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک ہے۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے قسم کھائی کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی ایسا شخص نہیں جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو یعنی حلقۂ چشم (آنکھ کا حلقہ ہر انسان کا سیاہی اور سفیدی دونوں رکھتا ہے۔ (مذاق العارفین: 3/181)

حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہونے پر رسول اکرم ﷺ کا مسکرانا

غزوات میں سے غزوۂ بدر بہت مشہور ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھا اور فرمایا (اے اہل بدر) اب تم جو چاہے کرو میں تم کو بخش چکا ہوں، حق وباطل کے اس موقع کے لیے مسلمان نکلے تو سواریوں کی بہت قلت تھی، ایک سواری میں تین تین مجاہد حصہ دار تھے، حضور اکرم ﷺ کی سواری کی بھی یہی حالت تھی، اس سفر میں چشم فلک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ جو رحمتِ عالم ﷺ کی سواری میں حصہ دار تھے، امام الانبیاء نے انہیں اپنے اونٹ پر سوار کر رکھا ہے اور خود پیدل چل رہے ہیں، غلام بار بار عرض کرتا ہے، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، آپ سوار ہو جائیے، میں پیدل چلتا ہوں، نبی ﷺ نے فرمایا: نہیں، بھائی! اب سوار ہونے کی تمہاری باری ہے اور تم

مجھ سے زیادہ پیدل نہیں چل سکتے اور پھر میں بھی تو حق کی راہ میں پیدل چلنے کے ثواب سے محروم نہیں رہنا چاہتا، ابھی کچھ سفر ہی کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ابولبابہ (رضی اللہ عنہ) تم مدینہ واپس چلے جاؤ اور وہاں رہ کر میری نیابت کا فرض ادا کرو، حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کا شمار عظیم صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ کے مقام و مرتبہ کا کیا کہنا کہ سرور عالم ﷺ کی نیابت کا شرف نصیب ہوا، حضور ﷺ میں حصہ دار ٹھہرے، حضور ﷺ نے خود پیدل چل کر ان کو سوار کرایا، حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ عہد رسالت کے تقریباً تمام غزوات میں شریک رہے، غزوہ احزاب کے موقع پر ان سے ایک عجیب واقع پیش آیا، جس سے ان کو بڑا دکھ ہوا!

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّـهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ "اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں خلل مت ڈالو اور تم جانتے ہو۔" (سورۃ انفال:27)

یہ آیت ابو لبابہ بن عبد المنذر کے حق میں اتری ہے جبکہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں بنو قریظہ کے یہودیوں کی طرف بھیجا تھا۔ حکم رسول کی شرط مانتے ہوئے قلعہ خالی کر دیں۔ یہودیوں نے ان کے حسب مرضی مشورہ دیا، اس کے بعد ہی ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا اور وہ ڈر گئے کہ یہ تو اللہ اور رسول کی خیانت ہوئی، چنانچہ قسم کھا بیٹھے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانہ لے گا، مر جائیں گے لیکن کھانا نہ کھائیں گے۔ اب مسجد میں آئے، ستون سے اپنے کو باندھ دیا، نو(9) دن اسی حالت میں گزرے، بھوک پیاس سے غش کھا کر گر گئے، حتیٰ کہ رسول اکرم ﷺ کی زبانی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی، لوگ بشارت دیتے ہوئے آئے اور چاہا کہ ستون سے کھول دیں، ابو لبابہ رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے صرف اللہ کے رسول ﷺ کھول سکتے ہیں، چنانچہ اللہ کے رسول نے کھولا تو کہنے لگے یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے سب مال صدقہ کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، صرف تیسرا حصہ صدقہ ہو گا۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ

یوں کہ انہوں نے کفار قریش کو نبی ﷺ کے قصد سے آگاہ کرنے کے لیے خط لکھا، یہ فتح مکہ کے وقت کی بات ہے، اللہ نے رسول ﷺ کو آگاہ فرما دیا، آپ ﷺ نے پیچھے ہی آدمی کو دوڑا دیا، وہ خط پکڑا گیا، حاطب کو بلایا گیا، حاطب نے اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہنے لگے، یا رسول اللہ (ﷺ) اس کی گردن اڑا دیجیے، اس نے اللہ ور سول ﷺ سے خیانت کی ہے، تو حضرت فرمایا، عمر جانے دو، یہ بدر کے جہاد میں شامل تھا، کیا تمہیں خبر نہیں کہ مجاہدین بدر کے بارے میں اللہ نے فرما دیا ہے کہ میں نے تمہیں بخش دیا ہے، تمہارے سب گناہ معاف ہیں، صحیح تر بات یہی ہے کہ آیت میں عمومیت سے اگرچہ یہ درست ہے کہ آیت کا شان نزول ایک سبب خاص ہے اور علماء کے نزدیک عموم کے قائل ہو سکتے ہیں، خصوصی سبب نہیں تو نہ سہی، اور خیانت کی تعریف چھوٹے بڑے لازم اور متعدی سب ہی گناہ شامل ہیں۔

جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تھے۔ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہ ﷺ خوشی سے مسکرا دیے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جب حضور ﷺ کو مسکراتا ہوا دیکھا تو عرض کیا، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے، جناب کے مسکرانے کی وجہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی توبہ منظور کر لی ہے۔"

(تفسیر ابن کثیر، سورۃ الانفال، آیت نمبر:27)

اللہ کے رسول ﷺ ایک بار حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، آپ ﷺ نے وضو کر کے مسکرا دیا!

حمران بن ابان روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ انہوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا اور وضو کرنے کے بعد ملا دیا، اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ میں نے کیوں مسکرایا ہے؟ پھر انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے ہی وضو کیا جیسا کہ میں نے کیا پھر آپ ﷺ مسکرائے، پھر آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں نے کس لیے مسکرایا ہے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اس کا علم ہے! آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر نماز ادا کرتا ہے اور اچھی طرح نماز ادا کرتا ہے تو وہ نماز کے بعد ایسے گناہوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ ماں کے پیٹ سے گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔

(مسند احمد: ج1، حدیث:430، صحیح)

آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم کہہ دو، دھوکہ نہیں چلے گا!

حضرت حباب بن منقذ رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی تھے، ان کا پیشہ تجارت تھا ایک مرتبہ ان کے ساتھ دھوکہ ہو گیا وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور سارا ماجرا سنایا کہ ان کی تجارت میں دھوکہ ہو گیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے (مسکراتے ہوئے) فرمایا کہ آئندہ جب بھی تم تجارت کرو، سودا کرنے سے پہلے کہہ دو کہ دھوکہ نہیں چلے گا۔

(صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث:2117)

☆☆☆

ایک دو کے سوا تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی جائے ولادت۔۔۔یروشلم (سرزمین اسلام)۔۔۔

اس میں واقع دنیا کی دوسری قدیم ترین مسجد۔۔۔

تمام انبیاء اور امت اسلام کا قبلہ اول۔۔۔

مسجد الاقصیٰ۔۔۔بیت المقدس۔۔۔کی زیارت اور وہاں نماز کی ادائیگی خوش قسمتی کی دلیل سمجھی جاتی ہے اسی طرح اس کی زیارت۔۔۔ایک قدیمی اور فطری خواہش تھی۔ مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران کئی فلسطینی طالب علموں سے دوستی تھی۔ ان کی زبانی وہاں کی داستانیں سنی جاتی تھیں لیکن فلسطین جانے کا کبھی سوچا نہ تھا۔ برسوں پہلے بھی فلسطین جانے کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا لیکن بوجوہ ممکن نہ ہو سکا۔ برٹش پاسپورٹ کے حصول کے بعد اس کا امکان پیدا ہو گیا تھا لیکن کوئی شناسا نہیں مل رہا تھا جس کی ہمراہی میں سفر کیا جا سکے۔ حرمین شریفین، کئی عرب اور یورپی ممالک کے علاوہ امریکہ جانے کا اتفاق تو بنا لیکن بیت المقدس جانے کی خواہش محض ایک آرزو ہی رہی۔ 2017ء میں اللہ کریم نے یہ موقعہ بھی پیدا فرما دیا۔ 19 اپریل کو پاکستان جانے کیلئے پا بر کاب تھا کہ برمنگھم سے برادر عمر یاسین صاحب کا میسج ملا کہ آپ ہمارے ساتھ فلسطین کے سفر پہ چلنے کیلئے تیار ہیں؟ میں نے استخارہ کیلئے وقت مانگا اور تین دن بعد ہاں کر دی، اپنا اور اہلیہ کا پاسپورٹ وٹس ایپ کر دیا۔

19 مئی کو پاکستان سے واپس آیا تو عمر بھائی نے خوشخبری سنائی کہ مانک ایئر لائن (Monarch Airline) پر مانچسٹر سے تل ابیب کیلئے 11 جولائی کی بکنگ ہو چکی ہے۔ ہمارے قافلے میں مزید بارہ افراد بھی شامل تھے۔

منگل 11 جولائی کی صبح ہم مانچسٹر ایئر پورٹ پہنچے۔ عمر بھائی کے والد ڈاکٹر یاسین اپنے قافلے کے ہمراہ انتظار میں تھے۔ کاؤنٹر پہ جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دس دس کلو دستی سامان ہی تھا۔ چونکہ یہ اکانومک فلائٹوں کے اندر کچھ بھی سرو نہیں کیا جاتا، تاہم کھانا آپ جہاز میں لے جا سکتے ہیں لیکن پانی کی بوتلیں ایئر پورٹ کے اندر سے ہی خریدنی پڑتی ہیں، ہم نے بھی کافی مقدار میں کھانا ساتھ لے لیا تھا اور پانی کی دو بڑی بڑی بوتلیں ایئر پورٹ سے خرید لی تھیں۔ جہاز میں کافی اور چائے کی کئی قسمیں میسر ہوتی ہیں۔ ایک ایک کپ پونے تین پونڈ کا ملتا ہے لیکن وہ بھی سستا لگتا ہے۔ جہاز میں جب سوار ہوئے تو مسلمان صرف ہمارا ہی قافلہ تھا۔ باقی سب یہودی تھے اور خاصے مذہبی۔ ان میں عورتیں، مرد اور بچے جو اپنے مخصوص حلیے، چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں جو کامن پنیں لگا کر قابو کی ہوئی تھیں اور لمبی لمبی لٹوں کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے، اپنے چچازاد (کیونکہ ہم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور یہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی) کو اتنی کثیر تعداد میں ایک ساتھ دیکھنے کا پہلا چانس تھا اور ان لوگوں کے کھردرے رویے، تنے چہرے، ہمہ وقت گھومتی اور گھورتی آنکھیں ان کے یہودی ہونے کی نشاندھی کر رہی تھیں۔ آنکھیں سرزمین مقدس کی زیارت کی امید اور اس کی پہلی جھلک دیکھنے کیلئے بے تاب تھیں۔ ہلکا پھلکا کھاتے پیتے ساڑھے چار گھنٹے کی فلائیٹ کے بعد ہم "تل ابیب کے بن گوریان ائیر پورٹ" کے رن وے پر اترتے جہاز سے بحر روم کے نیلگوں پانیوں کی آڑ میں مغربی طرزِ تعمیر کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے شہر کی عمارتیں، شاہراہیں اور ان پر شام کی بڑھتی ہوئی ٹریفک کا سماں دیکھتے رہے۔ یہ علاقہ "لد" کا ہے، (جہاں دجال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو گا) اسے جافا بھی کہا جاتا ہے یہ وہی سمندر کا کنارا ہے جہاں صاحب الحوت (مچھلی والے نبی حضرت یونس علیہ السلام) کو مچھلی نے باذنِ الٰہی پہنچا دیا تھا وہ شجر یقطین کے نرم پتوں کے تکیے پر لٹا دیے گئے تھے۔ طیارہ لینڈ کرنے سے پہلے ہی WI-Fi کے ذریعے فون آن ہو گیا۔ ہم نے برطانیہ اور پاکستان میں اپنے عزیزوں کو فلسطین پہنچنے کی خوشخبری سنا دی۔

بن گوریان کافی بڑا ہوائی اڈا ہے، لیکن بے نُور سا۔ امیگریشن کاؤنٹرز پر بڑا رش تھا۔ ایک طرف ذرا اژدھام کم تھا۔ اس جانب ہم بھی قطار میں لگ گئے۔ ہمیں پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا کہ اسرائیل ائیر پورٹ پر ممکن ہے، انٹری کلیرنس حاصل کرنے میں تاخیر کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے دیگر ائیر پورٹس کی نسبت یہاں کسی کو جلدی نہیں ہوتی۔ میری باری آئی تو میں نے اپنا اور ام فریال کا پاسپورٹ شیلوم (السلام علیکم کا بگڑا ہوا لفظ کہتے ہوئے کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ نوجوان لڑکی نے بڑے سپاٹ چہرے کے ساتھ پاسپورٹ لے کر میری طرف دیکھا میں نے خوش مزاجی سے کہہ دیا کہ اس سرزمین پر آتے ہوئے زندگی کی بڑی خوشی مل گئی ہے، اس نے بے جان سے لہجے میں "یو ویلکم" کہتے ہوئے معروف دو سوال کیے کہ پہلی دفعہ آنا ہوا؟ کب تک ٹھہرنا ہے یہاں کوئی ملنے والا تو نہیں ہو گا۔ مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور مجھے پاسپورٹ اور اس کے ساتھ انٹری کلیرنس کارڈ تھما دیا گیا، لیکن ام فریال کا پاسپورٹ یہ کہتے ہوئے رکھ لیا کہ چند سوالات کرنے ہیں۔ میں نے کہا کر لو، بولی نہیں یہاں ایک سسٹم ہے تم اگر چاہو تو چلے جاؤ اگر اہلیہ کے ہمراہ انتظار کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ میں نے کہا، میرے ساتھ اہلیہ ہی نہیں چند اور بھی ساتھی ہیں۔ بولی ان کے ساتھ انتظار کر لو۔ اسی طرح میرے گروپ کے چند اور ساتھیوں کو بھی روک لیا گیا۔ ہم

انتظار گاہ میں چلے آئے۔ وہاں بے شمار لوگ انٹری کلیئرنس کے انتظار میں نظر آئے۔ کچھ خواتین مصر سے تھیں انہیں پچھلے تین گھنٹے سے انتظار میں بٹھایا ہوا تھا۔ ایک نوجوان لیبیا کا تھا، نمازِ عصر کا وقت ہوا تو اس نوجوان نے ایک کونے میں نماز کی نیت باندھ لی، جونہی اس نے نماز پڑھنی شروع کی تو اسرائیلی آفیسرز اس کے اردگرد منڈلانا شروع ہوگئے۔ میں نے بھی وہیں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد ہم نے کھانے پینے کا سامان نکالا اور وہیں دسترخوان جما لیا۔ دو گھنٹے کے بعد اہلیہ کو دفتر میں بلا کر کہا گیا کہ والد اور دادا کے نام لکھ دو جو لکھ دیے گئے، لیکن ابھی بھی پاسپورٹ نہ دیا کہا باہر انتظار کرو۔ مزید دو گھنٹے انتظار کے بعد ہمارے دیگر شرکاءِ سفر سمیت جانے کی اجازت مل گئی۔

جب ہم نے "انٹری پاس" پر ٹائم دیکھا تو وہ وہی تھا جو میرے کارڈ پر لکھا تھا یعنی 5.16 منٹ یعنی میرا اور اہلیہ کو ویزہ اسی وقت دیا گیا تھا لیکن انہیں یونہی بٹھا دیا گیا۔ جبکہ ہمارے رہنمائے سفر ڈاکٹر یاسین صاحب کا انتظار تو بہت طویل ہوگیا۔ سارا قافلہ کلیئر ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیں پہلے ہی تین چار گھنٹے ایئر پورٹ پر گزر چکے ہیں۔ باہر بس آئی ہوئی ہے، آپ سب کو لے جانے کیلئے۔ میں نے بہتیرا کہا کہ ہم مزید گھنٹہ انتظار کر لیتے ہیں۔ ہمارے لیے ایئر پورٹ پر انتظار کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نہیں مانے اور ہم ایئر پورٹ لاؤنج میں آگئے، وہاں چائے یا کافی کی طلب ہوئی، لیکن کوئی شاپ نظر نہ آئی۔ ایک جگہ کارڈ ڈال کر کافی کا چھوٹا سا کپ مل سکا۔ جو غنیمت جانا۔ وہیں ایک جرمن خاتون بھی امیگریشن سے فارغ ہو کر آئی تھی روہانسی ہو رہی تھی بتانے لگی کہ میرے خاوند کا سر نیم "محمد" ہے اور اس وجہ سے مجھے بہت تنگ کیا گیا۔ حالانکہ میں عیسائی ہوں۔ ہمیں باہر چلنے کا کہا گیا جہاں چار گھنٹے سے ایک بس ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ جہاں ہماری میزبان خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ گھنٹے بھر کی ڈرائیو کے بعد ہم یروشلم پہنچ گئے۔ رات میں باہر کا نظارہ صرف لائٹیں ہی تھیں، ان کے سوا کچھ نظر نہ آیا، حالانکہ ہمیں بڑا اشتیاق تھا۔ محلہ المسعودی میں واقع وکٹوریہ ہوٹل اترے۔ اس محلے کو دیکھ کر مدینہ منورہ کے قدیمی شہر کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہ بھی اسی طرح کا سادہ سا ہوا کرتا تھا۔ ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ کے بعد ہمیں اپنے اپنے کمرے دکھا دیے گئے۔ ہم نے وضو بنا کر مغرب وعشاء پڑھ کر آرام کیا حالانکہ مسجد اقصیٰ دیکھنے کا اشتیاق آرام کرنے کی نسبت بہت زیادہ تھا لیکن وہاں صبح ہی جانا ہو گا، پروگرام کے مطابق ہمیں صبح نماز تہجد کے کیلئے مسجد اقصیٰ جانے کیلئے صبح تین بجے ہوٹل کی لابی میں پہنچ جانا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر یاسین صاحب بھی ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ صبح تین بجے سبھی لوگ لابی میں پہنچ چکے تھے، اللہ کا نام لے کر ہم باہر نکلے، مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والا دروازہ ہمارے ہوٹل سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہم سمجھتے رہے کہ یہی مسجد اقصیٰ کا گیٹ ہے لیکن پتہ چلا کہ یہ اولڈ سٹی یروشلم کا ہیروڈیس گیٹ ہے جہاں سے قریبی دروازہ بھی آدھ میل نشیب میں واقع ہے۔ کم از کم تین چار سو میٹر نشیب میں واقع مسجد اقصیٰ کا اس وقت کھلا ہوا دروازہ باب حطہ ہے (غالباً یہ قرآنی لفظ ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْلَكُمْ﴾ سے ماخوذ ہے)

قدیمی شہر یروشلم کا تعارف

مسجد اقصیٰ پرانے شہر (Old Sity) یروشلم کے اندر واقع ہے۔ ہمارا ہوٹل (Victoria Hotel) محلہ المسعودی میں، جہاں سے اولڈ سٹی یروشلم کا نزدیکی گیٹ پانچ منٹ کی واک پر ہے۔ اس قدیمی شہر کو بلند فصیل کے ساتھ کور کیا گیا ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ ایک کلو میٹر کے رقبے میں واقع ہے۔ مسجدِ اقصیٰ حاضری سے پہلے ہم دنیا کے اس قدیم اور مقدس شہر کا کچھ تعارف کروائے دیتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی تاریخ کا تعلق فلسطین کی تاریخ سے ہے اور فلسطین کی تاریخ کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جبکہ آپ کے دوسرے بیٹے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے عبادت کیلئے مسجدِ اقصیٰ تعمیر کی تھی جیسے چالیس سال پہلے ان کے بڑے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے سرزمین حجاز میں بیت اللہ تعمیر کیا تھا۔ جبکہ شہر یروشلم کی تاریخ کا استناد حضرت داؤد علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان محتاط روایات کے مطابق 2600 سال کا وقفہ (Gap) ہے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا داؤد علیہ السلام کے درمیان تقریبا ساڑھے نو سو سال کا وقفہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان 2000 سال کا وقفہ ہے۔

اور شہر یروشلم (جس میں مسجد اقصیٰ واقع ہے) کی مستند تاریخ ایک مذہبی کتاب عہد نامہ قدیم Old testament میں ولادت عیسوی سے گیارہ سو سال پہلے کی ملتی ہے، گویا یہاں دو تواریخ سانس لے رہی ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی بابت تو ہم آگے بیان کریں گے۔ لیکن آج کی نشست میں شہر یروشلم کا تعارف کراتے ہیں جو عموماً سفر ناموں میں موجود نہیں ہوتا۔ اسے ہم نے کافی کتابوں اور مضامین سے چھانٹ کر اپنے حساب سے مرتب کیا اور کوشش کی گئی ہے کہ اس مواد کو صحیح طریقے سے فٹ کیا جائے۔ چونکہ یہ تاریخ ہے اس لیے کمی بیشی کا امکان ہے۔ صحیح تاریخ اور واقعات تو اللہ ہی کے علم میں ہیں۔

عہد نامہ قدیم Old testament کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں یہاں یبوسی قوم آباد تھی، یہ مضبوط دیواروں کے ساتھ قلعہ بند شہر تھا۔ معرکہ طالوت و جالوت جس کا تذکرہ قرآن کریم سورہ البقرہ کی آیات 249 تا 251 میں ہے۔ یہ شہر حضرت داؤد علیہ السلام ہاتھوں فتح ہوا۔ وہی اس کے بادشاہ بنے۔ اسی لیے اسے شہر داؤد CITY OF DAVID) کہا جاتا ہے موجودہ شہر، جنوب مشرقی دیوار کی طرف باب مغاربہ سے باہر تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے، تو انہوں نے اس شہر کو وسعت دی۔ شہر کی دوسری دفعہ حد بندی "نحمیا"

کے دور 440 قبل مسیح میں ہوئی اور تیسری حد بندی ولادت عیسوی سے 40 قبل یہودیہ کے بادشاہ ہیروڈیس اغریپا نے ایک نئی دیوار تعمیر کر کے کی تھی۔

یروشلم کا معنی سرزمین اسلام ہے

یروشلم کا قدیمی نام 1200 ق م سے 1000 تک ایک قلعہ کی وجہ سے "یبوسی" یا "ارھا بیوسی" رہا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ تو انہوں نے اس کا نام "تسیون" یا "صیہو" رکھا۔ پھر اس کا نام "یروشالم" یا "یروشالیم" رکھا گیا۔ جو اصل میں "اسلام" ہے۔ عبرانی میں سلام کو شلوم کہا جاتا ہے اس لحاظ سے اس کا معنی اساس الاسلام ہوا یعنی جہاں ارض اسلام۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا۔ جیسا کہ دنیا کی سب سے سچی کتابِ الٰہی کا بیان ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے 975 ق م میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی جسے ہیکل سلیمانی کہا جاتا ہے۔ اسے بخت نصر نے 586 ق م میں تباہ کر دیا تھا۔ پھر 515 ق م میں ہیروڈیس میں بنایا تھا جسے بعد میں تباہ کر دیا گیا اس کی صرف ایک دیوار حائط البراق یا حائط المبکی باقی رہی۔ یاد رہے کہ مسلمان اسے دیوار براق اور بنی اسرائیل اسے دیوار گریہ کہتے ہیں۔ 1291ء میں ایوبی خاندان کے سلطان دمشق المعظم عیسی شرف الدین نے کسی وجہ سے شہر کی دیواروں کو مسمار کروادیا۔

1229ء میں یروشلم معاہدہ مصر کے تحت فریڈرک دوم کے قبضے میں چلا گیا۔ جس نے 1239ء میں دیواریں دوبارہ تعمیر کروادیں۔ مگر امیر کرک نے بعد میں پھر ان دیواروں کو مسمار کرادیا۔ 1243ء میں یروشلم پر عیسائیوں کا پھر قبضہ ہو گیا جنہوں نے دیواروں کی پھر مرمت کرادی۔ 1244ء میں تاتاریوں نے شہر پر قبضہ کیا تو دیواریں پھر توڑ ڈالیں۔ تا آنکہ سلطنت عثمانیہ کے سلطان سلیمان اول جنہیں سلیمان القانونی بھی کہا جاتا ہے یروشلم کی دیواریں پتھر سے تعمیر اکرادیں اور اب تک وہی دیواریں موجود ہیں۔ ان دیواروں کی لمبائی تقریباً تین میل اور اونچائی 16 سے 49 فٹ ہے۔ ان دیواروں کی وجہ سے 144 ایکڑ زمین مسجد اقصیٰ کی ملکیت میں رہی ورنہ شاید یہ جگہ بھی محدود رہ جاتی۔ 1980 میں اردن نے یروشلم شہر کو عالمی ثقافتی ورثہ بنانے کی تجویز پیش کی۔ 1981 میں ان دیواروں کو اس فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ یعنی اب ان دیواروں کو توڑنا بین الاقوامی قانون کے تحت ممنوع ہے۔ (ان میں سے بیشتر معلومات آزاد معارف ویکی پیڈیا سے لیکر ترتیب دی گئی ہیں)

شہر یروشلم کے دروازے

بارہویں صدی کی صلیبی جنگوں تک یروشلم کے چار دروازے تھے جو ہر ایک سمت میں تھے۔ موجودہ دیوار سلطنت عثمانیہ کے سلطان سلیمان القانونی نے تعمیر کروائی جس کے گیارہ دروازے ہیں جن میں سے سات کھلے ہیں اور چار بند کر دیے گئے ہیں۔ تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1887ء تک ہر دروازہ فجر کے وقت کھولا جاتا تھا اور مغرب کے وقت بند کر دیا جاتا تھا۔

کھلے دروازے

1۔ شمالی جانب کا دروازہ باب جدید (Gate of Hammid) جسے 1187 میں تعمیر کیا گیا۔

2۔ وسط شمال کا دروازہ باب دمشق، اسے باب العمود (Gate of the Pillar) بھی کہا جاتا ہے۔ 1537 میں تعمیر کیا گیا۔

3۔ شمال مشرق کی طرف باب الساہرہ (ہیروڈیس گیٹ، یا فلاور گیٹ اور (Sheep Gate) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کا سن نہیں مل سکا۔

4۔ شمال مشرق وسط میں باب اسباط (Gate of the Tribes) اس کی تعمیر بھی 1539 میں ہوئی۔ اسباط قبیلوں کو کہا جاتا ہے۔ سورہ بقرہ اور آل عمران میں ویعقوب ولاسباط کا نام آتا ہے یعنی مختلف قبیلے تو یہ گیٹ شاید انہی کی طرف منسوب ہے۔

5۔ جنوب مشرق میں باب مغاربہ (Gate of Silwa) جسکی تعمیر 1538ء میں کی گئی تھی۔

6۔ وسط جنوب میں باب صیہون یا باب داؤد (Gate of the Jewish) اس کی تعمیر 1540 میں ہوئی تھی۔

7۔ وسط مغرب میں باب الخلیل (Gate of David's Prayer)

بند دروازے

1۔ وسط مشرق میں باب رحمت (Gate of Mercy)۔ جو چھٹی صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔

2۔ قدس الشریف کی مغربی دیوار میں ایک محرابی دروازہ جسے ہیروڈیس کے دور میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دروازہ مصلی مروانی کی جانب سے زیر زمین علاقے کی طرف جاتا ہے، اسے مستقل طور پر بند کر دیا گیا ہے اور اسرائیلی اسی جانب سے مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگ کھود رہے ہیں۔ مسجد قبلی کے پہلو میں مسجد عمر کے اندر سے کھڑکی کھول کر دیکھیں تو یہ دروازہ اور اسرائیلیوں کی کھدائی نظر آتی ہے۔

3۔ دو محرابی دروازہ یہ بھی قدس الشریف کی مغربی دیوار میں ہے اور دور ہیروڈیس میں اسے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بھی مستقل بند ہے۔

4۔ ابواب خولدیا Trilpe Gate یہ بھی مغربی دیوار میں تھا، تین تکونوں یا حشرات الارض کی بہتات کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ بھی ہیروڈیس کے دور میں بنایا گیا تھا۔

مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہونے سے پہلے ہم آپ کو یروشلم کے محلوں کی سیر کراتے ہیں۔

یروشلم کے محلے

کے شمال مشرق میں واقع چار محلوں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ آبادی والا محلہ ہے۔ یہ مشرق میں باب اسباط سے شمالی دیوار کے ساتھ بیت المقدس اور مغربی جانب مغربی دیوار کے ساتھ باب دمشق تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی

2005ء میں 22,000 نفوس پر مشتمل تھی قدیم شہر کے دیگر تین محلوں کی طرح 1929ء کے فسادات سے پہلے یہاں بھی مسلم یہودی اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی۔ اسی محلہ میں مسلمانوں کے متبرک مقامات ہیں اور کئی مساجد ہیں، مثلاً مسجد عثمان، مسجد اقصیٰ، قبہ معراج، قبۃ الصخراء، مسجد عمر، مصلی مروانی وغیرہ۔

2۔ مسیحی محلہ حارۃ النصاریٰ قدیم شہر کے شمال مغربی کونے میں واقع ہے یہ شمال میں مغربی دیوار کے ساتھ باب جدید سے باب الخلیل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس محلے میں کلیسائے مقبرہ مقدس بھی موجود ہے جسے زیادہ تر مسیحی مقدس ترین مقام سمجھتے ہیں۔ مسیحی محلے میں تقریباً چالیس مسیحی مقدس مقامات ہیں۔ حالانکہ آرمینیائی بھی مسیحی ہیں لیکن ان کا محلہ عیسائی محلہ سے الگ ہے۔ مسیحی محلہ زیادہ تر مذہبی سیاحتی اور تعلیمی عمارتوں پر مشتمل ہے۔ جیسے سینٹ جیمس کتھیڈرل، کلیسائے مقبرہ مقدس، نجات دہندہ کا لوتھری گرجاگھر، سینٹ توروس گرجاگھر وغیرہ۔

3۔ آرمینیائی محلہ حارۃ الارمن۔ قدیم شہر کے چار محلوں میں سب سے چھوٹا محلہ ہے۔ 1948ء عرب اسرائیل جنگ کے بعد چاروں محلے اردن کے زیر انتظام آگئے۔ 1967ء کی 6 روزہ جنگ کے نتیجے میں یروشلم اسرائیل کے زیر تسلط آگیا۔ 1967ء کی جنگ کے دوران آرمینیائی خانقاہ کے اندر پائے جانے والے دو بم پھٹ نہ سکے، جنہیں ایک معجزہ تصور کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں 3000 سے زیادہ آرمینیائی یروشلم میں مقیم ہیں۔ جن میں سے 500 سے زائد آرمینیائی محلے میں رہتے ہیں۔

4۔ یہودی محلہ Jewish Quarter (حارۃ الیہود) شہر کے جنوب مشرقی علاقے میں واقع ہے۔ یہ جنوب میں باب صیہون سے مغرب میں آرمینیائی محلہ تک اور مشرق میں مغربی دیوار اور کوہ ہیکل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہودی محلہ بھی تاریخی مقامات سے اٹا پڑا ہے۔

1967ء کی جنگ کے بعد یہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا، اس کے چند ہی دنوں بعد اسرائیلی حکام نے مراکشی محلہ کے انہدام کا حکم دے دیا اور وہاں مقیم لوگوں کو زبردستی نکال باہر کیا تاکہ یہودیوں کو دیوار گریہ تک رسائی کی سہولت فراہم کی جاسکے۔ کنیسہ خرابہ (برباد کنیسہ) اسی محلے میں واقع ہے۔ 2010ء میں اسے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ یہاں چار سفاردی کنیسہ جات بھی ہے۔ یہ چار کنیساؤں کا ایک مجموعہ ہے جو مختلف ادوار میں تعمیر کئے گئے۔

5۔ مراکشی محلہ، مراکون کوارٹر مغربی محلہ یا حارۃ المغاربہ۔ قدیم یروشلم جنوب مشرق میں مغربی دیوار جو اصل میں تو دیوار براق ہے لیکن یہودی اسے دیوار گریہ کہتے ہیں۔ اس کے جنوب میں باب مغاربہ اور مغرب میں یہودی محلہ واقع تھا۔ یہ مسلم محلہ کی توسیع تھی جسے صلاح الدین ایوبی کے بیٹے نے بارہویں صدی میں بنوایا تھا۔ 1967ء کی جنگ کے بعد یہودی قبضے میں آتے ہی اسرائیلی حکومت نے مراکشی محلہ کو منہدم کر دیا اور زبردستی یہود کو یہاں لا بسایا۔

صلیب مسیح سے منسوب گلی

قدیم یروشلم میں دو حصوں میں منقسم ایک گلی ہے جسے راہ غم، راہ درد (way of Sorrows) یا 'طریق الآلام' کہا جاتا ہے۔۔۔ یعنی وہ راستہ جس پر عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام قید خانے سے اپنی صلیب خود اٹھا کر چلتے ہوئے مقام مصلوبیت پر آئے تھے۔ اس راستے کی لمبائی تقریبا 2000 فٹ یا 600 میٹر ہے۔ عیسائی روایت کے مطابق صلیب اٹھا کر جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام چلتے ہوئے رکے یا گرے تھے۔ پندرہویں صدی کے اواخر سے ان مقامات کی تعداد چودہ ہے۔ موجودہ راستے "راہِ غم" پر نو مقامات پر صلیب زدہ نشانات ہیں، جبکہ پانچ کلیسائے مقبرہ مقدس کے اندر ہیں۔ مقام مصلوبیت پر اب مقبرہ مقدس قائم ہے۔

(Jerosalam Murph O'Connor The Holy Land 2008 pages 37)

قرآن کریم ان روایات کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہہ کسی شخص کے ساتھ ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں ہوا۔ انہیں تو حق تعالیٰ نے بحفاظت آسمانوں پر اٹھالیا تھا۔

قدیم شہر کے گرد و نواح کی شاہراہیں

شہر قدیم میں چار سڑکیں چہار سمت کی ہیں، شارع یافا، شارع اریحا، شارع صلاح الدین، شارع سلطان سلیمان۔ یافا۔۔۔ باب یافا اور شارع یافا۔۔ دونوں قدیم بندرگاہ "یافا" کے نام پر ہیں۔

یافا۔۔ وہ بندرگاہ ہے، جہاں حضرت یونس علیہ السلام اپنے بحری سفر پر روانہ ہوئے تھے اور زائرین مقدس شہر کے لیے اسی بندرگاہ پر اترتے تھے۔ اب ہم مسجد اقصیٰ چلتے ہیں۔

پہلا دن: بروز بدھ 12 جولائی 2017ء بمطابق 18 شوال 1438ھ

مسجد اقصیٰ کی زیارت کیلئے آنے والے تمام ساتھیوں کو صبح تہجد کے وقت مسجد اقصیٰ پہنچنے کا پروگرام دیا گیا تھا۔ لیکن ان کو جمع ہوتے ہوتے کافی دیر لگ گئی، مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والا شہر یروشلم کا دروازہ ہمارے ہوٹل سے پیدل صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا (جسے ہم اب تک مسجد اقصیٰ کا گیٹ سمجھتے رہے تھے) سمت کا صحیح تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے رہنما مخالف سمت چلے گئے۔ تھوڑے سے تردد کے بعد صحیح راستہ مل گیا، لیکن کچھ مزید تاخیر ہوگئی۔ یروشلم کے ہیروڈیس گیٹ پر اسرائیلی گارڈز مسلح گنوں کے ساتھ متعین تھے، ہمارے ساتھ کوئی تردد نہ کیا گیا اور ہم یروشلم میں داخل ہو گئے (ہیروڈیس گیٹ کا تعارف ہم پہلے کروا چکے ہیں) "ہیروڈیس" کا نام ہم نے بچپن میں (مروجہ انجیل میں) ولادت

عیسیٰ علیہ السلام کے اور حضرت یحیٰ علیہ السلام کے سفاکانہ قتل کے ضمن میں پڑھا تھا اور ہمارے دماغ میں یہ نام چپکا ہوا تھا۔ آج اس کو دیکھ کر عجیب سا ناقابل بیان احساس پیدا ہوا۔

ہیر وڈیس کون تھا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس دور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں یروشلم پر رومیوں کا قبضہ تھا، جنہوں نے ایک مقامی فلسطینی شخص کو وہاں اپنا نمائندہ بنا رکھا تھا یہ تھا ہیر وڈیس، جو یہودی تھا لیکن بنی اسرائیل میں سے نہیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بھائی عیسو کی نسل سے تھا۔ بنی سرائیل ہمیشہ اس نسل والوں کے مخالف رہے، لیکن ہیر وڈیس نے مسجد اقصیٰ یا ہیکل سلیمانی کی تعمیر میں کوئی کسر نہیں اٹھار کھی جس کے بنی اسرائیل بھی معترف رہے۔ دوسری طرف غالباً یہی وہ بادشاہ ہے، جس کا ایک بیٹے "ہیرود اینٹی پاس" جو شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرق اردن کا مالک بن گیا تھا اور اسی نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحیٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا تھا۔ یا بقول امام طبری رحمۃ اللہ علیہ کے جس نے اپنی کسی محرم عورت (بھانجی یا بھتیجی) سے شادی کرنا چاہی تھی۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خالہ زاد تھے) نے اس امر کی مخالفت کی جس پر ان کے قتل کا حکم دے دیا گیا اور انہیں بیت المقدس میں "مقام صخرہ" پر۔۔۔ جہاں اب گنبد بنا ہوا ہے۔۔۔ وہاں پر ذبح کر کے ان کا سر کاٹ کر دمشق میں اس بدکار عورت کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ واللہ اعلم) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اِلی السماء کے بعد 70 سال تک ہیر وڈیس کی قائم کردہ ہیکل کی بلڈنگ قائم رہی۔ تا آنکہ رومیوں نے فلسطین پر چڑھائی کر دی اور طیطوس نے سارا ہیکل تباہ کر دیا۔ صرف ایک دیوار بچی۔ یہودی اس ہیر وڈیس کی بنائی ہوئی دیوار کے سامنے جا کر روتے اور یہودی دور کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ اسی دیوار کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر براق باندھا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے دیوار براق بھی کہا جاتا ہے۔

ہم اسی ہیر وڈیس گیٹ سے داخل ہو کر نشیب کی طرف اترنا شروع ہو گئے۔ قدیم چکنے پتھروں سے بنا ناہموار راستہ خاصا طویل تھا مگر سبھی اس ناہموار راستہ پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی سوفٹ نشیب میں واقع مسجد اقصیٰ کا دروازہ "باب حطہ" اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے کے باہر بھی اسرائیلی دستے بلٹ پروف جیکٹیں پہنے اور سنگینیں تانے کھڑے تھے۔ مسجد کے دروازے پر پہنچے تو اذان تہجد بلند ہو رہی تھی۔ اذان کے ترنم سے ہم کچھ اتنے مسحور ہو گئے، جیسے ہم مسجد اقصیٰ میں ہی نہیں کسی نئی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ دعائے دخول مسجد پڑھ کر اندر قدم رکھا تو احساس تشکر سے آنکھیں تر ہو گئیں۔ دروازے کے اندر مسلمان گارڈز نظر آئے جن کے پاس اسرائیلی فوجیوں کی طرح کا کوئی اسلحہ نہیں تھا، صرف واکی ٹاکی تھی۔ ہم نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر ہمیں اھلا وسھلا و مرحباً کہا۔ ہم نے بھی عقیدت و محبت کے ملے جلے جذبات سے جواب دیا۔ نام اور ملک بارے پوچھا۔ ہمیں لگا جیسے ہم اپنے حقیقی بھائیوں سے مل رہے ہیں۔ سچ ہے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ آگے بڑھنے سے پہلے ہم مسجد اقصیٰ کے دروازوں کی آپ کو سیر کراتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے دروازے

یاد رہے کہ مسجد اقصیٰ کے 14 دروازے ہیں:

باب حطہ۔ باب الاسباط۔ باب الجنائز۔ باب الرحمہ۔ باب فیصل۔ باب الغوانم۔ باب الناظر۔ باب القطانین۔ باب المطہرۃ۔ باب السلسۃ۔ باب المغاربۃ۔ باب المزدوج۔ باب الثلاثی اور باب المفرد۔ ان میں سے باب حطہ، باب الاسباط، باب الناظر، باب السلسلہ اور باب المغاربہ" کھلے ہیں، جن میں سے کئی ایک سے ہمیں داخلے کا موقع ملا۔ اندرونی دروازوں پر ہمیں جانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اس لیے ان کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ "باب الرحمہ" کو دیکھا لیکن یہ دروازہ بالکل بند ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دروازے سے داخل ہوں گے۔ باب الجنائز سے ملحقہ مسلمانوں کا قبرستان ہے، جہاں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبور مبارکہ ہیں۔ باب المغاربہ۔۔۔ جہاں سے دیوار براق کو راستہ جاتا ہے، جسے انہوں نے دیوار گریہ۔۔۔ کا نام دے رکھا ہے۔ کئی دروازے مستقل طور پر بند رکھے جاتے ہیں۔ (نئی خبر یہ ہے کہ 2018ء میں باب الرحمت بھی کھول دیا گیا ہے)

(اس کے بعد ان شاء اللہ مسجد اقصیٰ کی تھوڑی سی تاریخ کا تذکرہ کیا جائے گا۔)

☆☆☆

یوسف جمیل جامعی نہ صرف مولانا تھے بلکہ ایک ادیب اور شاعر اور ایک ہمدرد انسان تھے، ہر ایک کے وہ کام آتے تھے، ایک مشفق اور مہربان ادب نواز انسان تھے۔ وہ جامعہ رائیدرگ کے فارغ التحصیل تھے مگر جنوبی ہند کے ہر جامعہ میں مقبول ومحمود تھے۔ جامعہ دار السلام عمر آباد کے سالانہ مشاعرہ میں تشریف لائے تو اپنے صدارتی خطاب میں شعروشاعری اور علم وادب پر یادگار خطبہ صدارت پیش کیا، جس سے سارے سامعین بہت ہی محظوظ اور مسرور ہوئے۔ کرنول میں ان کا حلقۂ اثر بڑا وسیع تھا۔ مولانا عبد الجبار عمری، مولانا عبد الغنی عمری، مولانا خرم جامعی حیدرآبادی، مولانا ظہیر دانش عمری حیدر آبادی، ریاض پاشاہ عمری، شیخ اسماعیل افضل حیدر آبادی وغیر ہم ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ کتابوں کے بڑے رسیا تھے، پتہ نہیں گھر میں دینی اور ادبی کتنی کتابیں ہوں گی مگر جہاں کہیں انہیں کوئی نئی کتاب نظر آتی بڑھ کر اسے خرید لیتے اور اپنا سرمایہ بنا لیتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن زاہد اعظمی عمری ﷫ ایڈیٹر ماہنامہ 'راہ اعتدال' عمر آباد بھی ان کا ذکر خیر فرماتے تھے۔ وہ انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے، ان کے اندر کسی قسم کا عجب اور گھمنڈ نہیں تھا، وہ ایک مثالی عالم دین اور ادیب وشاعر تھے۔ ان کے فرزند اور دختر ان بھی دینی اور عصری علوم سے آراستہ وپیراستہ اور بہترین اخلاق وتربیت سے مزین ہیں جن میں والدین کی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ مولانا جمیل دو شعری مجموعے چھوڑ گئے ہیں:
1۔ عکس جمیل 2۔ ذوق جمیل

تیسرے مجموعے کے تعلق سے انہوں نے بذریعہ واٹس ایپ یہ بتایا کہ تیسرے مجموعہ کے بقدر کلام موجود ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کی طباعت کی تیاری کریں اور یہ بات ان کی وفات سے صرف چند دن قبل ہوئی تھی۔ ماشاء اللہ وہ خود ایک بہترین کمپوزر تھے، اس لیے ٹائپنگ اور سیٹنگ کا مسئلہ بھی کوئی نہیں تھا۔ اب ان کے فرزند عقیدت مند اور ادیب وشعراء حضرات کی ذمہ داری ہے کہ ان کے ادبی اور علمی باقیات کو منظر عام پر لائیں تا کہ خلق خدا اس سے مستفید ہو سکے۔

اب آیئے اس معروف ادیب اور شاعر کا مختصر تعارف ہو جائے۔

شاعر کا نام: محمد یوسف
قلمی نام: جمیل جامعی
تاریخ و مقام پیدائش: 20/ اگست 1951ء، بلہاری، کرناٹک
قابلیت: سند فضیلت وعالمیت جامع محمدیہ عربیہ رائیدرگ۔ منشی فاضل، تروپتی یونیوسٹی، ایم اے اردو میسور یونیورسٹی، بی او ایل عثمانیہ یونیورسٹی۔
پیشہ: استاد فارسی، عمر عربک ہائی سکول کرنول
مشغلہ: دعوت وارشاد و خطبات جمعہ، شعر وشاعری ونثر نگاری۔
جن مجلات میں مضامین شائع ہوئے تھے: روزنامہ رہنمائے دکن، رونامہ منصف، روزنامہ سیاست حیدر آباد، دکن، راشٹریہ سہارا، بزم سہارا، پندرہ روزہ ترجمان دہلی، نوائے اسلام دہلی، بزم آئینہ، پیکر خوشبو وشاہین کرنول، صوت الاسلام ممبئی، ماہنامہ صراط مستقیم برمنگھم، راہ اعتدال عمر آباد وغیرہ۔

صحافت: مدیر کاروان سلف
ایوارڈز واعزازات: نیشنل بیسٹ ٹیچر، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش اسٹیٹ۔۔ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ کرنول ڈسٹرکٹ، بدست پنڈت دیال شنکر شرما صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں 1992ء میں دیا گیا۔۔ فخر جامعہ ایوارڈ، جامعہ محمدیہ عربیہ رائیدرگ۔۔ خادم جماعت ایوارڈ، احیاء التراث الاسلامی کویت۔۔۔ سرپرست بزم اردو کرنول۔

مرحوم جماعت اہل حدیث آندھرا پردیش کے سابق امیر بھی رہ چکے تھے۔ زندگی بھر ان کی کوشش اتحاد امت کی طرف مبذول رہی، چونکہ اپنے اس مشن میں وہ مخلص تھے، اس لیے اس کے ثمرات بھی انہیں اور دیگر جمعیتوں کے اکابرین و اراکین کو دیکھنے کو ملے۔

صرف ایک ہفتہ کہ معمولی بخار کے بعد وہ 3 اپریل 2020ء بروز جمعرات افطار کے بالکل قریب مالک حقیقی سے جاملے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون اور کرونا کے کھاتہ میں ڈالے گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے بچوں کو جو عالم وفاضل اور عالمات ہیں ان کو والد مرحوم کی طرح دین اسلام کے مخلص داعیان بنائے۔ آمین

مولانا جمیل اپنے دوسرے مجموعہ کلام ذوق جمیل کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں کہ

"تعلیم کی تکمیل کے بعد میں ملازمت کی غرض سے کرنول آیا تو یہاں خوبصورت ادبی ماحول نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سچ پوچھیے تو میری ادبی زندگی کا حقیقی سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں کرنول میں علامہ یسیر کا طوطی بولتا تھا۔

طرز غالب میں لکھنے کی وجہ سے انہیں غالب دکن کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کے مصاحبین میں مولانا عبد الغنی غنی (جو بڑے باریک بین اور تحقیقی ذہن کے مالک تھے) سے بھی رسم وراہ ہوئی۔ آگے چل کر میں نے انہیں دو حضرات سے مشورہ سخن کیا جس کی وجہ سے میرے کلام میں پختگی آگئی۔۔"

جمیل جامعی کے کلام میں حمد ونعت، منقبت ومناجات، غزلیات، نظمیں، رباعیات، قطعات، تعزیتی نظمیں، ترانے اور تہنیتیں اور مزاحیہ کلام غرضیکہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیات میں امجد حیدر آبادی کا رنگ نمایاں ہے، اکثر آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو رباعیات میں ڈھال کر اپنے کلام کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے، اب ان کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

☆تو اگر نہیں دل میں آسودگی نہیں ہے
تو جہاں جہاں نہیں ہے وہاں زندگی نہیں ہے

☆ہے سکت کہاں یہ آقا کہ جمیل حمد کہہ دے
مرے نطق اور قلم میں کوئی عمدگی نہیں ہے

☆مٹادے اپنے ہستی کو جو ناموسِ محمد ﷺ پر
اسی کی عالم بالا میں اونچی شان ہوتی ہے

☆بچا کر چلو اپنا اپنا عقیدہ
عقیدہ اٹھانے کے دن آگئے ہیں

☆فراق یار میں اکثر جمیل ایسا بھی ہوتا ہے
خموشی سے چھلک جاتے ہیں بس آنکھوں کے پیمانے

☆وہ زیر لب تبسم ہی سے قتل عام کرتے ہیں
مزاج یار میں پائی گئی ہے سادگی کتنی

☆یوسف ہوا گر چاک گریباں بھی تو غم کیا
اعلان تری پاکی کا کرتے ہیں شب وروز

☆میرے اشعار مری فکر کا آئینہ جمیل
جھانکئے ان میں اگر گہری بصیرت ہو گی

☆پہرے لگاکے آپ یہ نازاں ہوا عدو
اس کو خبر کہاں کہ سمندر حسین ہیں

اب آخر میں دو رباعیاں بھی دیکھ لیجیے:

☆صدقے سے زر ومال میں برکت ہو گی
منفق کے لیے حشر میں راحت ہو گی

☆ممسک ہو گر زاہد بحر وبر بھی
قسمت میں کبھی اس کی نہ جنت ہو گی

☆ایک پیمانہ لبریز ہوا جاتا ہوں
صورت برف میں ہر روز گھلا جاتا ہوں

☆منتظر ہوں میں ترے حکم کا اے رب کریم
تیرا بندہ ہوں ترے پاس چلا آتا ہوں

اب آخر میں یہی کہوں گا:

"خدا بخشے بہت سے خوبیاں تھیں، یوسف جمیل، میں"

آمین یارب العالمین!

راقم الحروف نے ان کی وفات پر چند اشعار میں اپنے تاثرات غم کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

وہ تو تھے سب کے خلیل نام تھا جن کا جمیل
کام تھا ان کا عظیم مرتبہ ان کا جلیل
رکھتے تھے قلب سلیم خواہشیں ان کی قلیل
فکر وفن، کردار میں رکھتے تھے جوہر جلیل
علم دیں سے لیس وہ دین سے دیتے دلیل
اک سخنور معنی خیز شعر کہتے وہ جمیل
بے سبب کرتے نہ تھے ہر کسی سے قال وقیل
چل دیے وہ ناگہاں سن کے آواز رحیل
زندگی ہے مختصر آخرت راہِ طویل
بخش دے جنت انہیں اے خداوند جلیل
کر عطا کوثر کے جام بخش ان کو سلسبیل!

☆☆☆

مولانا مختار احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ وفات پا گئیں

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے سابق امیر، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سابق نائب صدر، معروف مصنف اور خطیب اور مشہور عالم دین مولانا مختار احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ اور اسلم مختار، مولانا اکرم مختار اور مولانا ارشد مختار کی والدہ ماجدہ اور مولانا شیر خان جمیل احمد عمری کی خوشدامن صاحبہ 90 سال کی عمر پا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

مرحومہ نہایت خلیق اور پابند شرع خاتون تھیں، مولانا مرحوم نے جہاں دینی، دعوتی، تصنفی، تالیفی، تعلیمی اور رفاہی میدانوں اور جمعیت وجماعت کے پلیٹ فارم سے بہت ساری خدمات انجام دیں، ان تمام مختلف وکثیر الجہات مراحل میں مرحومہ نے ایک مثالی شریک حیات کا بھرپور کردار ادا کیا، اس طرح ایک مثالی شریک حیات اور مثالی ماں کی حیثیت سے بھرپور زندگی گزار کر اس دار فانی سے دار البقا کو کوچ کر گئیں، مرحومہ کے فرزند نے نماز جنازہ پڑھائی اور ویسٹ ممبئی سانتا کروز میں تدفین عمل میں آئی۔ برمنگھم میں مولانا جمیل نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔

پسماندگان میں تین صاحبزادے اور پانچ عالمہ فاضلہ صاحبزادیاں اور متعدد پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں شامل ہیں جو مختلف ممالک ومتعدد جگہوں پر توحید وسنت کے کاز سے جڑے ہوئے ہیں، جو مولانا مرحوم کے ساتھ ساتھ مرحومہ کے لیے بھی صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے۔ ان شاء اللہ

دعا ہے کہ اللہ کریم مرحومہ کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل بخشے۔

آمین یارب العالمین

☆☆☆

نماز کے فرائض سنت اور مستحبات کی تفصیل و تقسیم اسوۂ نبی طریق صحابہ اور عمل سلف صالحین کے خلاف ہے۔ اسلامی شریعت بہت سادہ اور تکلفات سے پاک وصاف ہے۔ جسے فقیہانہ موشگافیوں اور تقلید شخصی سے ملوث کر کے بہت مشکل بنا دیا گیا ہے۔ اس سے اُمت اسلامیہ کئی فقہی مذاہب میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

سنت پر بدعات غالب آنے لگ گئیں اور پوری امت تقسیم در تقسیم کی نحوست کا شکار ہو گئی مثلاً چھے کلمے حالانکہ کسی حدیث میں 6 کلموں کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک کلمہ اسلام لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور شہادہ کے لیے أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ۔ اسی طرح اذان میں آگے پیچھے کئی کچھ چیزوں کا اضافہ جو بلالی اذان میں ہرگز نہ تھا۔ وضو کے فرائض مستحبات اور نمازوں کے فرائض ومستحبات کی تفصیل و تقسیم ایک مسلمان کے لیے بنیادی طور پر قرآن وسنت احادیث صحیحہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی روشنی میں ہی قابل حجت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ تقسیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پائی جاتی تھی۔ ہرگز نہیں اسی لیے یہ سوال کہ نماز میں کتنے فرائض، واجبات اور کتنی سنتیں ہیں؟ یہ بتانے کا کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا اور سلف صالحین اس کو بُرا جانتے تھے۔ جیسا کہ مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور مشکاۃ (ج 1 ص 113) میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: "هل الوتر واجب" کیا وتر فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا: فقال أوتر رسول الله ﷺ والمسلمون کہ واتر واجب اور فرض کیا ہوتا ہے؟ نبی ﷺ اور مسلمانوں کا طریقہ وتر پڑھنا ہے اور بس تم بھی پڑھو۔ اسی طرح سیر اعلام النبلاء للذہبی (ج 8 ص 114) میں ہے، عبد اللہ بن رماح کی روایت ہے کہ نماز کے فرائض وواجبات ومستحبات ونوافل وغیرہ پوچھنے والے کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ کسی زندیق کا سوال ہو سکتا ہے، ایسے شخص کو میری مجلس سے اٹھا دیا جائے۔ عن عبد الله بن الرماح قال دخل على مالك فقلت يا أبا عبد الله ما في الصلاة من فريضه؟ وما فيها من سنة؟ أو قال نافله؟ فقال مالك كلام الزنادق اخرجوه (اسحاق بن منصور (ج 1 ص 132، 133، ت 189) اسی طرح کی قیل وقال سے منع اس لیے کیا گیا کہ اس طرح کی تقسیم وتفصیل کے ذریعے سے کفار دین اسلام کو بگاڑنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے سوالات کو سلف صالحین بدعت سمجھتے تھے جیسا کہ

"امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک نماز میں واجبات کیا ہیں؟ فرائض کیا ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا، تو نے واجبات نماز کے بارے میں پوچھا تو (سن لو کہ) (نماز ساری شروع سے لے کر آخر تک واجب ہے۔ جو لوگ دوسرے لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ "نماز میں یہ سنت ہے اور یہ فرض ہے۔" ان لوگوں کی یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو نماز سکھائی تو اس میں سنتیں سکھا دیں اور فرائض بتا دیے۔ جو ہم اور یہ لوگ اس میں پڑھتے ہیں۔"

لیکن کسی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ نماز کے حصے بنا دے اور کہے کہ نماز کے لیے اتنے فرض ہیں اور اتنی سنتیں ہیں، بے شک یہ بات بدعت ہے۔ (مسائل الامام احمد بن حنبل واسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ)

اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"سئل إسحاق عن الواجب في الصلاة عندكم، وعن ما لا بدَّ منه؟ فقال: وأما ما سألت عن الواجب في الصلاة أيها هي؟ فإن الصلاة كلّها من أولها إلى آخرها واجبة، والذين يقولون للناس في الصلاة سنة، وفيها فريضة خطأ من المتكلم، ولكن لا يجوز لأحدٍ، أن يجعل الصلاة أجزاءً مجزأةً، فيقول: فريضته كذا، سنته كذا فإن ذلك بدعة."

اور تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کا اصل چہرہ چھپا دینے اور امت کو تقسیم در تقسیم میں الجھا دینے میں اسی فلسفیانہ موشگافیوں اور قیل وقال کا بڑا ہاتھ ہے لیکن اسلام ایک مکمل اور دائمی دین ہے، اس لیے امت کا بڑا مؤثر طبقہ اسلام کے اصل چشمہ صافی قرآن وحدیث کو اس کی اصل صورت میں باقی رکھنے کا قائل وفاعل ہے۔

مرید ہندی (علامہ اقبال) نے پیر رومی سے پوچھا۔ میں مشرقی ومغربی علوم وفلسفوں کو جان چکا ہوں لیکن روح پھر بھی مضطرب ہے؟

پڑھ لیے میں نے علوم شرق وغرب
روح میں باقی ہے درد وکرب

پیر رومی نے جواب دیا کہ "برنا اہل ڈاکٹر وحکیم نے بے ہنگم دوانیاں دے دے کر تیر انظام بدن وروح بیمار کر دیا ہے۔ اب تجھے دوائی کی نہیں تیمار داری کی ضرورت ہے اس کے لیے تجھے اپنی ماں (قرآن وحدیث اور طریقہ سلف صالحین کی طرف آنا ہو گا جو تجھے دوا نہیں پیارے دے گی کیونکہ تجھے اس کی ضرورت ہے۔"

دست برنا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آتیمارت کند

فرانس میں اسلامی اسکول کو بند کر دیا گیا

گزشتہ ماہ فرانس کی حکومت نے فرانسیسی مسلمانوں میں علیحدگی پسند رجحانات پر قابو پانے کے مفروضہ دعویٰ کی بنیاد پر پیرس میں واقع اس واحد سیکنڈری اسکول کو بند کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ جس میں زیر تعلیم طلباء اور طالبات کو ان کے مذہبی عقائد کے مطابق لباس زیب تن کرنے اور مذہبی علامات کو ظاہر کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی، چنانچہ جہاں مسلمان طالبات کو اسکارف پہننے کی آزادی تھی، وہیں یہودی طلبہ کو ان کی مخصوص ٹوپی پہننے عیسائی طلبہ کو صلیب لٹکانے کی آزادی دی گئی تھی۔ مگر موجودہ حکومت نے بنیاد پرست اسلام کے خاتمہ کے بہانے اس اسکول کو بند کر کے اسکول میں زیر تعلیم 110 طلباء وطالبات کے تعلیمی مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

اس حوالے سے اسکول کی ہیڈ ٹیچر حفان اوکیلی کا کہنا ہے کہ گزشتہ ایک سال سے ہمارا اَسکول حکومت کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا، چنانچہ گزشتہ چند ماہ کے دوران بلڈنگ ریگولیٹیز اور ایڈمنسٹریشن کی جانچ پڑتال کے نام پر حکومتی عہدیداران کی جانب سے تین دفعہ چھاپے پڑ چکے ہیں، جن میں طلباء وطالبات کے شخصی ریکارڈز، ان کے فیملی پس منظر، اسکول کے نصاب اور اساتذہ کے شخصی ریکارڈز کی چھان بین کی جاتی رہی۔ بیشک حکومت کی جانب سے اسکول کو بند کرنے کا فیصلہ سراسر ناانصافی اور تعصب پر مبنی اقدام ہے، جس کی ہر صورت مذمت کرنی چاہیے۔ واضح رہے کہ موجودہ حکومت نے فرانس میں مقیم مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو ہر ممکن انداز میں ختم کرنے اور ان میں لبرل ذہنیت کو فروغ دینے کی مہم چلا رکھی ہے چنانچہ گزشتہ تین سال میں بنیاد پرست اسلام کے خاتمہ کا نعرہ بلند کر کے حکومت اب تک 15 مساجد، 4 اسلامی مدارس اور 13 اسلامی خیراتی اداروں (چیریٹیس) کو بند کر چکی ہے۔

سویڈن اور جرمنی میں مسجد کی بے حرمتی

جرمنی کے جنوب میں واقع اور تمبیرغ کی مرکزی مسجد الفاتح کو چند نامعلوم شرپسندوں نے پچھلے دو ہفتوں میں دو دفعہ نسلی حملوں کا نشانہ بنا کر مسجد کی دیواروں اور دروازوں کو نقصان پہنچایا۔

قابل ذکر اَمر یہ ہے کہ نسلی پرستی پر مبنی پہلے حملہ کی اطلاع مسجد کمیٹی کی جانب سے مقامی پولیس کو دی جاچکی ہے۔ جس میں ان شرپسندوں نے مسجد کی دیواروں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ دیواروں پر صلیب کے نشان بنا کر نسل پرستی پر مبنی جملے بھی تحریر کیے تھے۔

مگر پولیس کی جانب سے مؤثر عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے گزشتہ جمعہ کی رات دوبارہ مسجد میں داخل ہو کر مسجد کی بے حرمتی اور اس کی کھڑکیوں اور زنجیر کو نقصان پہنچایا۔ مسجد کمیٹی نے دوبارہ پولیس میں رپورٹ درج کرواتے ہوئے پولیس کو ان واقعات کی وجہ سے مقامی مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے عدم تحفظ کے احساس سے واقف کرایا اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مؤثر عملی اقدام کا مطالبہ کیا۔

اس سے ملتی جلتی ایک خبر سویڈن کے شہر اوسان میں واقع مسجد کے ذمہ داران کو حال ہی میں ایک پیکٹ موصول ہوا۔ جس میں دھمکی آمیز جملوں پر مشتمل ایک خط کے علاوہ سفید سفوف پر مبنی ایک لفافہ بھی تھا۔ ذمہ داران مسجد نے اس پیکٹ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

دریں اثنا مقامی مسلمانوں خصوصاً مسجد کمیٹی کے افراد نے اس قسم کی حرکتوں کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے کہا کہ ماضی میں بھی اس قسم کی شرارت کی جاتی رہی ہے۔ متعلقہ ذمہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ ان معاملات کو سنجیدگی سے لیں۔ وگرنہ حالات دن بدن مزید خراب ہوسکتے ہیں۔

صحیح البخاری کے حوالے سے مصری عدالت کا فیصلہ

گزشتہ دنوں مصر میں انتظامی اُمور کی ایک عدالت نے قاہرہ کے ایک پرائیویٹ ادارے شئوون التراث الاسلامی کے ریسرچ فیلو احمد عبدہ ماہر کی جانب سے داخل کیے گئے اس کیس کو خارج کر دیا جس میں مدعی نے کورٹ سے استدعا کی تھی کہ صحیح البخاری سمیت احادیث نبویہ پر مشتمل تمام کتب کی اعلیٰ علمی بنیادوں پر از سر نو تحقیق اور تنقیح کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ ان کتابوں میں موجود مواد انسانی معاشرے میں شدت پسندوں، تعصب اور تنافر کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ خصوصاً صحیح البخاری اس حوالے سے قابل ذکر ہے۔ لہٰذا عدالت جامعہ اَزہر کو اس اَمر کا مکلف بنائے کہ وہ اس حوالے سے ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دے۔

اس پر عدالت نے یہ کہتے ہوئے اس دعویٰ کو رد کر دیا کہ خصوصاً صحیح البخاری کو قرآن مجید کے بعد اصح الکتب کا درجہ حاصل ہے، جس پر ہر زمانے میں ساری امت کا اجماع چلا آرہا ہے، چنانچہ اس قسم کا اقدام در حقیقت ان عناصر کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو اُمت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ تواتر کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں، نیز سنت نبویہ کے حوالے سے فتنوں کو ہوا دے کر سنت کے ساتھ اُمت کے مضبوط تعلق کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی سوچ کی ہر اعتبار سے حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔